www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جنوری 2022

یومِ جمہوریہ مبارک

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

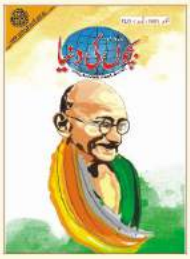

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد:6 شمارہ:1 جنوری 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع : ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت : دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون : 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ :110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	عظیم آباد کی ایک صاحب دیوان شاعرہ جمیلہ خاتون	ڈاکٹر مہتاب جہاں	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		12
جہان نسواں	حجاب کا ناول 'ظالم محبت'، رومانی فکر کا عکاس	ڈاکٹر سرفراز جاوید	13
	اختر شیرانی کی شاعری میں نسائی حسیت	ڈاکٹر راشد میاں	18
	عصمت چغتائی کی ڈرامائی کائنات	اشفاق احمد آہنگر	22
	اردو کی زندانی خودنوشت کا تنقیدی محاکمہ	صدف نفیس	27
	صغرا ہمایوں مرزا کا سفرنامہ "رہبر کشمیر"	ریحانہ بشیر	32
اعتراف ہنر	فکری توازن کی نمائندہ شاعرہ: رفیعہ شبنم عابدی	ڈاکٹر واحد نظیر	37
	رینو بہل بحیثیت ناول نگار	آسیہ یاسمین	41
حسن سخن	مسرور صغریٰ، آبگینہ عارف، شازیہ نیازی		45
افسانہ	ذمہ دار کون	نزہت نبیلہ	48
	روشنی کے سائے	ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک	52
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		56
صحت	سن بلوغت	ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی	58
آرائش و زیبائش			60
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		62

مشعل

نیا سال اور یوم جمہوریہ، قارئین کو مبارک

نیا سال، پرانے سال کا ہی تسلسل ہوتا ہے، پھر بھی ہم نئے سال پر کچھ نئی امیدوں کے ساتھ زندگی میں نئی تبدیلیوں کے خواہاں ہوتے ہیں اور اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ سال نو میں ہمیں یہ بھی احتساب کرنا ہے کہ گزشتہ برس ہم نے کیا حاصل کیا اور کیا حاصل کرنے میں ہم ناکام رہے۔ نئی امنگوں اور نئی آرزوؤں کے ساتھ ہم نئے سال کا خیر مقدم پورے جوش وخروش کے ساتھ کرتے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو لوگ اپنے ہدف کو حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں کامیابی یقیناً ان کا مقدر بنتی ہے۔

ہم اکیسویں صدی کی دو دہائی گزار چکے ہیں۔ اگر اس صدی کو نئے چیلنجز کی صدی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ آج ہمیں نئے نئے چیلنجز کا سامنا ہے خصوصاً خواتین کے سامنے آج بھی بہت سے مسائل جوں کے توں بنے ہوئے ہیں۔ اکیسویں صدی کے چیلنجز میں اہم چیلنج اعلیٰ تعلیم کا حصول ہے۔ خواتین کے لیے تحفظ کا ناقص نظام پدرسری نظریات خواتین کی ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ خواتین اپنے تحفظ کے لیے پوری طرح دوسروں پر منحصر ہیں۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے ان کو اپنے حقوق سے کوئی شناسائی نہیں ہے۔ ان میں بیداری لانے کے لیے ان کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنا ہوگا تاکہ وہ نئے مسائل کا سامنا کرسکیں۔

ہندوستانی خواتین خصوصاً دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین تعلیمی پس ماندگی کا شکار ہیں۔ وہ مکمل طور پر دوسروں پر منحصر رہتی ہیں اور انھیں اپنے حقوق کا علم نہیں ہوتا۔ بنیادی سہولیات سے بھی وہ محروم رہتی ہیں۔ آج سیاسی سطح پر خواتین کے لیے بہت سی اسکیمیں نافذ کی گئی ہیں لیکن تعلیمی پس ماندگی کے سبب ان میں اپنے حقوق کے تئیں بیداری نہیں آئی ہے جس کے سبب بیشتر خواتین ان سے فیض یاب نہیں ہو پاتیں۔

خواتین جن مسائل سے جوجھ رہی ہیں ان میں قدرے کمی تو آئی ہے لیکن وہ مسائل پوری طرح ختم نہیں ہوئے ہیں۔ کم عمر میں شادی، جہیز کی لعنت، گھریلو تشدد آج بھی عام ہے۔ ان کو تعلیم حاصل کرنے کا حق، اظہار رائے کی آزادی، وراثت کا حق، فیصلہ سازی کا قانونی طور پر حق دیا گیا ہے۔ ہندوستانی آئین میں بھی ان کے لیے قوانین اور حقوق بنائے گئے ہیں اس کے باوجود بھی ان کی حالت میں کافی سدھار کی ضرورت ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ بہت سی خواتین نے ماضی میں اپنی شناخت قائم کی تھی اور بہت فعال تھیں، آج بھی وہ معاشرے میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔ ان کی سوچ میں تبدیلی لانے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کو اپنے مقام و مرتبے کو سمجھنا ہوگا اور اپنے حقوق سے واقفیت حاصل کرنی ہوگی۔ خواتین کو اپنے آئینی حقوق کا استعمال کرتے ہوئے تعلیم یافتہ، باشعور اور بااختیار سماجی فرد ہونے کا جواز فراہم کرنا ہوگا اس کے لیے ان کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ بھی صحت مند معاشرے کی تشکیل میں اہم رول ادا کرسکیں۔

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر مہتاب جہاں

عظیم آبادکی ایک صاحب دیوان شاعرہ
جمیلہ خاتون

بہار کے بارے میں اگر بات کریں تو کیا کچھ نہیں ہے کہنے کو یہ خطہ ہمیشہ سے علم وادب اور علما وفضلا کا اہم مرکز رہا ہے اور اس کو ایک الگ امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے ۔اگر اس کی علمی تاریخ پر نظر ڈالیں تو جین اور بدھ مذہب کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا۔مغلوں کی سرپرستی کے بارے میں اگر بات کریں تو اورنگ زیب اور فرخ سیر کے عہد میں عظیم آباد مغلوں کا اہم مرکز تھا۔صوفیاء وقلندروں نے بھی بہار کو روشنی مزید بخشی ہے۔جن میں سرفہرست حضرت امام تاج فقیہ اور حضرت شرف الدین یحییٰ منیری ہیں۔دہلی یا حضرت دہلی ہمیشہ سے علماء فضلاء کے لیے کشش کا باعث رہی۔دور دور سے علما نے اس طرح رخ کیا تا کہ ان کو بھی سرخروئی حاصل ہو۔مگر اس معاملے میں بہار بھی پیچھے نہیں رہا۔اس سرزمین نے دہلی (شاہجہان آباد) کے شاعروں کو اپنی طرف رجوع کیا۔چند کے نام اطلاعاً درج کیے جاتے ہیں۔مثلاً ضیاء الدین ضیاء، نواب اشرف علی خان فغان ،حجرت رکن الدین عشق اور میر باقر حزیں یہ شاعر حضرات عظیم آباد کی شہرت سن کر اس طرف چلے آئے۔

بہار کی سرزمین نے ایک سے ایک عمدہ شاعروں کو جنم دیا جن میں سے بے حد باکمال شاعروں کے نام آتے ہیں۔کس کس کے نام گنوائے جائیں۔پھر بھی چند نام قابل ذکر ہیں۔بیدلعظیم آبادی، عمادالدین قلندر، شیخ غلام علی راسخ شورش عظیم آبادی۔شاد عظیم آبادی اور ان کے شاگرد بسمل عظیم آبادی، یاس یگانہ وغیرہ وغیرہ دوسری اصناف میں بھی اہل فن نے بہار کو چار چاند لگائے۔

مرد حضرات شعرا کے علاوہ خواتین شاعرات نے بھی بہار میں مقبولیت حاصل کی اور اس کا ثبوت ہم کو بیدل کے زمانے میں ملتا ہے۔حضرت بی بی ولیہ یہ بیدل کی ہمعصر تھیں۔ان کا کلام آج بھی موجود و دستیاب ہے ان کے علاوہ دیگر نامور شاعرات کا ذکر بھی ہمیں ملتا ہے۔اس مقالے میں طوالت کے باعث فقط ان شاعرات کے نام درج کیے جا رہے ہیں۔قابلِ ذکر نام یہ ہیں: امیر بیگم، اللہ جوائی، لطیف عظیم آبادی، امیر النساء، غریب عظیم آبادی، بلقیس جمال، بلقیس خانم، تصویر عظیم آبادی، بندی جان عظیم آبادی،، بی بی طاہرہ پھلواری، بی بی صالحہ عظیم آبادی، حمیدہ بانو گیاوی، رضیہ رعنا ارولی، زبیدہ، خاتون زاری عظیم آبادی، سیدۃ النساء سارنوی، صاحب جان معشوق عظیم آبادی، عظیم النساء عظیم آبادی، عشرت جہان رانچوی، عائشہ بیگم وفا سہرامی، کنیز فاطمہ حیا گیاوی گلاب ناز آروی، گنا جان حسن دربھنگوی، نکہت بھاگلپوری، ثارۃ الکبریٰ عظیم آبادی ولایتی بیگم یکتا عظیم آبادی وغیرہ۔

خان بہادر خدابخش کے نام سے کون واقف نہیں بانی خدابخش لائبریری پٹنہ (عظیم آباد) آپ رہتی دنیا تک اس کارِ خیر کے لیے جانے جائیں گے۔اس مضمون کا موضوع جمیلہ خاتون خدابخش خاں ہے

جوخدابخش خاں کی اہلیہ تھیں یہ تعارف محض قارئین کی آگاہی کے لیے دیا جارہا ہے۔ وگرنہ راضیہ جمیلہ خاتون اپنی شاعری کے سبب بذات خود مشہور ومعروف ہیں۔ بہار کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہونے کا شرف صرف ان کو ہی حاصل ہے بہت مختصر کلام ہونے کے باوجود۔ ان کے لاکھوں اشعار نہیں ہیں۔ مگر شہرتِ کلام اور دادِ سخن بے انتہا و بے شمار ہے۔ تفصیلِ حیات وآثار درج ذیل ہے:

راضیہ جمیلہ خاتون 1864 میں کلکتہ بنگال میں خان بہادر شمس العلماء مولوی کبیر الدین احمد کے گھر میں پیدا ہوئیں۔ گھر کی چہار دیواری میں ہی ان کی تعلیم وتربیت ہوئی جن میں مذہبی تعلیم کے ساتھ اردو کی بھی چند مذہبی کتابیں پڑھیں اس طرح اس زبان سے واقفیت حاصل ہوئی صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں جب خدابخش خان سے شادی ہوئی تو اپنا دیس بنگال چھوڑ کر پٹنہ سسرال چلی آئیں۔ شوہر کی ہمیشہ فرمانبردار رہیں۔ اطاعت گزاری، کا حق انھوں نے شوہر کے مرتے دم تک نبھایا۔ عمر میں شوہر سے تقریباً 26-25 سال چھوٹی تھیں اور ان کی تیسری اہلیہ (۔اس کے علاوہ ان کی پہلی بیوی طاہرہ خاتون ان سے پانچ اولادیں صلاح الدین، شہاب الدین، غیاث الدین، محی الدین عرف بشیر الدین اور ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جو کمسنی میں ہی فوت ہوگئی۔ دوسری بیوی خدیجہ خاتون تھیں ان سے عبدالغفور خان پیدا ہوئے۔ تیسری جمیلہ ان سے ولی الدین پیدا ہوئے۔ جمیلہ کے مطابق خدابخش نے چوتھی شادی بھی کی تھی مگر اولاد کی کوئی تفصیل یا اطلاع دستیاب نہیں ہوئی۔ یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کثیر الاولاد خدابخش کے ساتھ قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ ان کے تمام بچے لاولد رہے۔ جبکہ بڑے بڑے گھرانوں میں ان کی شادیاں ہوئیں۔) ان سب کے علاوہ ایک باکمال شاعرہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ انھوں نے اردو کی چند ہی کتابیں پڑھی تھیں مگر شاعری جب کی، تو بڑے پائے کی کی اور اس کی شروعات انھوں نے یونہی تک بندی سے کی اور وہ بھی اپنی ایک ملنے والی کے دیکھا دیکھی۔ کہ اگر وہ کرسکتی ہے تو میں کیوں نہیں۔ بس پھر کیا تھا شاعری کی شروعات ہوئی۔ اپنی خودنوشت سوانح میں اس کے متعلق کہتی ہیں: ''ایک بہن کی ملاقات کو جانا ہوا، انھوں نے مجھے ایک غزل دکھا کر کہا کہ دیکھو میں نے اس کو تصنیف کیا ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے شوہر نے یہ غزل کہہ کر بی بی کے نام کا مقطع لگادیا تھا۔ بہرکیف بہن کی غزل نے میرے دل کو طومارِ حسرت بنادیا۔ یہی خیال رہ رہ کر ستاتا تھا کہ آخر تو نے بھی تو کچھ شدبد کرلیا ہے تو بھی غزل لکھ سکتی ہے پھر لکھتی کیوں نہیں۔ اسی ادھیڑ بُن میں واپس آئی کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ کاغذ پنسل اٹھا تک بندی شروع کردی۔ نہ شعر کی دُم کی خبر تھی نہ سُم کی۔ جو جی میں آیا بے تکی اڑانا شروع کردیا۔ پھر کیا تھا یاروں کو شگوفہ ہاتھ آیا جس نے سُنا ہنس دیا۔ لوگوں کو چھیڑنے کا موقع ہاتھ آیا۔ مگر بندی کے پاپوش کو بھی خبر نہ ہوئی۔ میرے سر پر ایسا ویسا جن تو سوار نہ ہوا تھا جو معمولی ہنسی ٹھٹھے سے اتر جاتا۔ کاغذ پنسل اور میں، رفتہ رفتہ تُک بندی نے جامۂ شاعری پہننا شروع کیا۔''

جمیلہ خاتون کی شاعری پر تصوف کا رنگ زیادہ نمایاں ہے یعنی جس زمانے میں انھوں نے تُک بندی سے مخصوص شاعری کی طرف قدم بڑھایا اسی زمانے میں انھوں نے اپنے لیے ایک پیرومرشد کی بھی جستجو کی۔ اس کی بابت کہتی ہیں۔ ''اُسی زمانے میں پیرومرشد مولانا حضرت شاہ مرشد علی صاحب جیلانی و بغدادی قدس سرہٗ کے ہاتھوں پر مرید ہوئی مرشد کی توجہ میرے حال پر ایسی ہوئی کہ......غزلوں کا لکھنا آسان سے آسان کام نظر آنے لگا۔ بقول شخصی ع

بادل سے چلے آتے ہیں مضمون میرے آگے

اللہ کی کبریائی کے صدقے وہی حضرات جو ہماری تُک بندی پر ہنستے تھے غزلوں کو بچشم حیرت دیکھتے اور سچی تعریفیں کرنے لگے''

جمیلہ خاتون اپنی اور غزلوں کی بابت مزید اطلاع یوں دیتی ہیں:

''میں نے کسی کو غزل لکھتے دیکھا نہ سنا۔ نہ بحر رجز سے واقف نہ بحر رمل سے۔ پھر یہ کس چیز کی داد دیتے ہیں۔ فاعلات فاعلات تو میں اس وقت تک نہیں جانتی۔ غرض میری شاعری کو امداد الٰہی یا فیضان قادریہ عالیہ یا کرامت مرشدی سمجھیے۔''جمیلہ خاتون کو اپنے پیرومرشد کے علاوہ حضرت عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم اور حضرت علی کرم اللہ وجہ سے بھی بے حد و بے پناہ عقیدت تھی اور ان کی شان میں بیشمار اشعار کہے ہیں۔ چند شعر:

الٰہی وقت گریہ غوث الاعظم کے قدم پر دل
ٹپک کر دیدۂ نم سے گر جاتا تو بہتر تھا

میں ہند میں ہوں پر بغداد میں ہے دل میرا
اب اس سے زیادہ کوئی اور کمال کیا ہوگا

ہند میں بیٹھی ہوں لیکن جوش میں ایک دن ضرور
دیکھ لینا دوڑ کے بغداد تک جائے گا دل

چند اور اشعار عبدالقادر جیلانی کی شان میں:

نام تمھارا غوث ہے جدّ میں تمہارے مذنبین
رب کو کہیں گے نعبد، تم کو کہیں نستعین

فرقتِ غوث راضیہ ہے بلا
آمدِ موت کی خوشی سی ہے

اے ابر کرم غوث امم بہر محمدؐ
بغداد کے کوچہ میں مجھے رہنے کی جا دو

تمھارے شیدائیوں کی تربتوں سے یہ آئی آواز غوث الاعظم
کفن ہے بیڑی ہماری حق ہے قید خانہ مزار اپنا

کبھی تو بھولے سے آ ادھر کو کھڑی ہوں میں بے نوا جدھر کو
تیری ہی فرقت سے غوث الاعظم ہوا ہے یہ حال زار اپنا

ہوں تشنہ بہ لب ہجر میں تیرے شہ جیلاں
ہاں شربت دیدار مجھے آج پلا دو

اب فدا کرنے کو غوث پاک پر
رونمائی اشک کی لاتا ہے دل

جمیلہ خاتون کے دیوانوں میں ان کے مرشد حضرت شاہ مرشد علی جمال کی شان میں جابجا اشعار نظر آتے ہیں:

آبرو دی جمال نے ہم کو
ورنہ مشتِ غبار تھے صاحب

موقوف مرگ پر ہے زیارت جمال کی
بس اے جمیلہ دوسری صورت نہیں رہی

چشمۂ فیضِ جمال وہ سمجھ لے اس کو
اس گنہ گار جمیلہ کا جو دیوان پائے

تو جو خاکِ کوئے جمال ہے یہ جمیلہ تیرا کمال ہے
نہ ہو کیوں بڑا تیرا مرتبہ، تیرا پیر صاحب حال ہے

کردیا مرشد نے ہے خوی جمال
اے جمیلہ بیٹھ تو جاتا ہے دل

کچھ منفرد اشعار ملاحظہ:

جامِ جمشید کیا کروں لے کر
دل ہے جامِ جہاں نما صاحب

دو ہی صورت جہان میں ہے خاتون
کوئی چھوٹا کوئی بڑا صاحب

طاق کسریٰ سے فزوں تھی کشتی ساغر تیری
کاسئہ مہتاب تیرے بزم کا پیمانہ تھا

کس جگہ تھی آج خاتون کیوں نہ آئی بزم میں
باغ تھا کالی گھٹا تھی ساغر و پیمانہ تھا

گدا کی طرح ہم صدا کر چلے
جنون خوش رہو ہم دعا کر چلے

پڑ گئی میرے گُل پہ تیری نظر
کیوں صبا آج باؤلی سی ہے

راضیہ جمیلہ خاتون کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر اگر غور کیا جائے تو کئی تخلص نظر آتے ہیں۔ مثلاً شروع کی شاعری میں ان کا تخلص خاتون تھا۔ پھر کہیں کہیں راضیہ بھی نظر آیا اور یہ سب ان کی شروعاتی شاعری میں ملتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے زیادہ تر جمیلہ ہی تخلص اختیار کیا۔ اس تخلص کے بارے میں بھی وہ کہتی ہیں۔ ’’ہمارے پیر و مرشد قدس سرہ جو اشعار میں جمال تخلص فرماتے تھے۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ تم ہماری مرید ہو۔ تمھارے سوا ہماری کسی مرید میں شاعری کی لیاقت نہیں۔ اس لیے میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنی غزلوں میں اپنا تخلص جمیلہ کیا کرو۔‘‘ چند اشعار ان کے خاتون تخلص سے متعلق:

خاتون ہے مداح دل و جان سے اے سرور
تم آتشِ دوزخ سے شہا اس کو بجھا دو
جو تھا دل اپنا اک ہمدم نہیں اب وہ بھی پہلو میں
لہو بن کر بہا خاتون وہ بھی چشم گریاں سے

راضیہ تخلص:

کمترین راضیہ خاتون کی تمنا ہے یہی
ہو خیال اس کی طرف اے شہ والا تیرا

ہے عشقِ غوثِ پاک ہیں خام راضیہ
مجھ کو یقین ہے یہ کوئی گل کھلائے گا

ندامت سے عصیان کے اے راضیہ
منہ اپنا کفن سے چھپا کر چلے

جمیلہ تخلص:

دل تھام لیجیے ہاتھ سے اپنے جمیلہ اب
تا حال دل حبیبِ خدا کو سنائیں ہم
تو خاکِ کوے جمال ہے یہ جمیلہ تیرا کمال ہے
نہ ہو کیوں تیرا بڑا مرتبہ، تیرا پیرا صاحب حال ہے

تو یہ تو تھا جمیلہ خاتون کی شاعری کا سفر تک بندی سے لے کر سنجیدہ اور صوفیانہ شاعری تک۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدرت الٰہی کی کرم فرمائی تو تھی ہی ان کی ذات پر، پیرو مرشد کی عنایت وکمال بھی حاصل تھا مگر دنیاوی ذرائع بھی یقیناً رہے ہوں گے جنھوں نے جمیلہ کی شاعری کو نکھارا اور سنوارا ہوگا یعنی کوئی تو استاد ہوگا ان کا کوئی تو ان کو اصلاح دیتا ہوگا۔ تو یہ گتھی بھی سلجھ گئی ہے، جمیلہ خاتون کے حالات سمجھنے اور جاننے کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت کے دو بڑے اور نامور شاعر ان کی شاعری ک اصلاح کررہے تھے جن کو جمیلہ خاتون نے بھی اپنے استادوں کے طور پر قبول کیا ہے۔ ایک نام ہے داغ دہلوی اور دوسرا نام بہار کے مشہور ومعروف شاعر شاد عظیم آبادی دونوں کے متعلق اپنی سوانح میں جمیلہ خاتون نے دلچسپ اور اہم اطلاعات فراہم کی ہیں۔ داغ دہلوی سے متعلق بیان کرتی ہیں:

''کچھ شعر تو آج تک میری سمجھ سے باہر ہیں کہ میں یہ کیسے کہہ گئی''

نام تمھارا غوث ہے جد ہے شفیع مذنبیں
رب کو کہیں گے نعبد تم کو کہیں گے نستعین

دوسرا شعر یہ ہے جس کو میں تو کیا سمجھتی مرحوم حضرت داغ دہلوی نے بھی اس پر ہفتوں سر مارا۔ آخر ہمارے شوہر نے چار ورق میں اس کی تشریح لکھ کر داغ مرحوم کو بھیج دی۔

یکتائی رب اور ظہور رسول پاک
نقشہ دکھا رہے ہیں الف لام میم کا''

خدا بخش خان چونکہ خود بھی شاعر تھے اور ان کا بھی جمیل تخلص تھا وہ ایک کھلے ذہن کے روشن فکر انسان تھے۔ انھوں نے جمیلہ خاتون کی شاعرانہ خوبی کو ضرور سراہا ہوگا تبھی تو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے اصلاح کے لیے داغ اور شاد عظیم آبادی کے پاس ان کی غزلیں خود لے جایا کرتے تھے یا ڈاک کے ذریعہ ارسال کرتے تھے۔ کیونکہ جمیلہ خاتون ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور اس وقت کا چلن بھی یہی تھا۔ خواتین کی آواز بھی غیر محرم سن نہیں سکتے تھے۔ خدا بخش کی وسیع النظری دیکھیے کہ انھوں نے اپنی اہلیہ کی خواہش کے احترام میں کہ مجھے ستار بجانا سیکھنا ہے تو انھوں نے جمیلہ کو ستار بجانے کی بھی تعلیم دلائی اور ایک اسّی سال کے پوپلے ستار نواز کو بڑی جستجو کے بعد مقرر کیا جو جمیلہ خاتون کو پردے کے پیچھے سے ستار بجانا سکھاتے تھے۔ مگر خدا بخش خان کا کوئی شعری مجموعہ دستیاب نہیں۔ مگر جمیلہ کا کافی شعری سرمایہ موجود ہے۔

تو ذکر اب دوسرے استاد شاد عظیم آبادی کا جس کو جمیلہ بڑے فخر سے بیان کرتی ہیں اور ان کی مدح سرائی میں ایک قطعہ بھی کہا تھا۔ یہ ایک خط کی شکل میں ہے:

''شاعر بے نظیر اپنے وقت کے میر سلامت رہیے۔ آپ نے اس ہیچ میرز کی غایت النہایت قدردانی فرمائی۔ میں بنگالہ کی رہنے والی کہاں اور اردو شاعری کہاں آپ کی توجہ سے میں شاعرہ بن گئی۔ اس وقت میرے خیال میں یہ بات آئی کہ اپنے قدر دان کے لیے کچھ لکھوں ایک قطعہ رواروی میں منظوم ہوا، بھیجتی ہوں۔ اگر پسند خاطر والا ہو تو اس کو اپنے دفتر میں جگہ دیجیے۔ میرے نزدیک تو پوڑیا باندھنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ کی عنایت نے بلند نام کیا ورنہ من ہمان خاکم کہ ہستم۔''

قطعہ

اے شاد شک نہیں ہے کہ استاد فن ہے تو
اور عندلیب گلشن شعر و سخن ہے تو
غالب ہے اپنے وقت کا راسخ ہے یا کہ میر
اس میں نہیں کلام کہ فخر وطن ہے تو
اے شاد شاعری میں تیرا مثل ہے کہاں
حسان عصر میر سا صاحب سخن ہے تو
آتی نہیں خزاں کبھی گلشن میں علم کے
جس میں سدابہار ہے بس وہ چمن ہے تو

تیرا نہیں جواب سخن آوروں میں ہے
ادنیٰ سی بات یہ ہے کہ فخر زمن ہے تو
شاعر بہت ہیں پر نہیں تجھ سا کہیں کوئی
پروانہ سب ہیں روشنی انجمن ہے تو
کیا اے جمیلہ مدح کرے گی تو شاد کی
تجھ میں کہاں مجال کہ بستہ دہن ہے تو

ریختہ گوئی میں بھی جمیلہ خاتون کی طبع آزمائی قابل تحسین ہے۔ اردو فارسی کی آمیزش سے خوب رنگ آمیزی ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

اس دور کا چلن تھا کہ ہندوستانیوں کے انگریز یا یہ کہیے بااقتدار سفید پوش حضرات سے دوستانہ تعلقات بھی تھے جس کا ذکر گاہ بہ گاہ شعراء حضرات نے اور اہل فن واہل علم حضرات نے اپنی نگارشات میں خوب کیا۔ اس کو برطانیہ نوازی بھی کہہ سکتے ہیں غالب اس میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جمیلہ خاتون بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ویسے بھی وہ ایک مہذب اور علمی گھرانے کی چشم وچراغ تھیں پھر بہو بھی ایسے ہی خاندان کی بنیں۔ لہٰذا انھوں نے بھی چند دعائیہ اشعار لارڈ کرزن کی اہلیہ کے لیے کہے جو بے حد جاذب نظر ہیں۔ ان اشعار میں بعض حضرات کو خوشامد کا پہلو بھی نظر آسکتا ہے مگر اب ہم جو چاہے سوچ اور کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں یہی وقت کا تقاضہ رہا ہوگا۔ واللہ اعلم۔ بہر حال ان کی نظم ''لندن'' میں چند شعر جو انھوں نے لیڈی کرزن کو معنون کیے تھے۔ ملاحظہ ہوں:

یہ تمنا ہے کہ دنیا میں تو آباد رہے
گلِ شگفتہ سا خنداں رہے اور شاد رہے
بذل اور عدل سے تیرے رعیت شاداں
گردش چرخ سے دشمن ترا برباد رہے
ہووے توسیع مبارک تجھے لیڈی کرزن
تیری حالت پہ سدا شاہ کی امداد رہے
لیڈی کرزن تو سلامت رہے دنیا میں مدام
اور اولاد تیری دہر میں آباد رہے
خوش رہے شاد رہے دہر میں لیڈی کرزن
آل و اولاد سے گھر حشر تک آباد رہے
لارڈ کرزن تیرے حق میں ہے یہ خاتون کی دعا
صد و سی و سال تو قائم رہے اور شاد رہے

جمیلہ خاتون نے جو بھی لکھا اس سے ان کی شاعری کی بلند مرتبی ظاہر ہوتی ہے لفظوں کو بڑی چابکدستی سے بروئے کار لاتی ہیں۔ کہیں کہیں صوفیانہ شعر کہنے کے باوجود خودستائی اور تعلّی بھی نظر آتی ہے اور یہ کوئی خامی بھی نہیں اکثر شعراء اپنے کلام کو مزید پُر تاثیر بنانے کی غرض سے اس کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ اشعار شاعرانہ تعلّی پر:

ہوں جمیلہ وہ سخنور کہ بقول راسخ
شاہ اقلیم معانی ہوئے ہم میر کی طرح
آسان نہیں تصوف ہر شخص جس کو جانے
میری غزل وہ سمجھے جو کوئی نکتہ داں ہو
شکر خدا کہ آج جو استاد عصر ہیں
حیرت زدہ ہیں دیکھ کے میرے کلام کو
میں ہوں جاہل مگر فطرت نے یہ امداد کی میری
کہ ہے بزم سخن میں ان دنوں رونق میرے دم سے
صرف لاعلمی نے ہم کو کھودیا
ورنہ ہوتے میر اپنے فن میں ہم
سو جان سے جمیلہ ہم استاد کہیں تم کو
گر ایسے ہی مضمون تم اللہ غنی باندھو

انکساری سے بھی عظیم آباد کی یہ شاعرہ جمیلہ خاتون لبریز نظر آتی ہیں:

کبر ونخوت سے جمیلہ مجھے کیا کام رہا
ساری مخلوق سے جب اپنے کو کمتر پایا

جمیلہ خاتون ایک علمی گھرانے کی بہو تھیں اور باوقار اور عالم وفاضل شخص کی بیوی۔ وقت نے ان لوگوں کو بھی خوب آزمایا۔ خدابخش حیدرآباد سے جب پٹنہ واپس لوٹے تو اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا اور یہیں سے ان کی زندگی میں پریشانی اور درد والم در آیا۔ کہتے ہیں کہ ایسے حالات میں ان کے بچوں نے بھی ان سے بے نیازی اور بے اعتنائی برتی۔ مگر اپنی کتاب میں ان کے بیٹے خدابخش صلاح الدین کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں کہتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی شہاب الدین خدابخش اور جمیلہ خاتون نے بڑی تیمارداری کی والد محترم کی۔ مگر جمیلہ خاتون کی شاعری بھی کچھ اور ہی حقیقتیں بیان کرتی ہے۔ جس وقت ان کی زندگی کسمپرسی اور تنگ دستی کے دور سے گزر رہی تھی۔ تبھی جمیلہ خاتون نے ایک دعائیہ نظم قلمبند کی چند شعر ملاحظہ ہوں جو ان کے حالات کی کھل کر عکاسی کرتے ہیں:

اس تیرگی بخت سے دن ہیں میرے سیاہ
جلوہ تُو اس پہ ڈال دے اپنے جمال کا
شوہر میرا ضعیف ہے مجبور ہے شہا

پرساں نہیں ہے کوئی بھی اب اس کے حال کا
اولاد ہیں جو پاس وہ ہیں اس کے برخلاف
موقع نہیں ہے جن سے ذرا قیل و قال کا
نفسانیت سے قرب ہے انسانیت بعد
اندیشہ کچھ نہیں انہیں میرے ملال کا
سلطانِ ہند دیجیے توفیق ٹھیک انہیں
کچھ تو خیال ہو انہیں اپنے مآل کا
مقروض ہوں غریب ہوں معذور بے نوا
انداز کچھ نیا ہے زمانے کی چال کا
بے کس جمیلہ آئی ہے در پر تیرے شہا
پرساں نہیں ہے تیرے سوا اس کے حال کا
ایک طفل میرا اپنا اے میرے دستگیر
پرساں نہیں ہے بھائی کوئی اس کے حال کا

جمیلہ خاتون خدابخش کی تیسری بیوی تھیں اور ان کے بطن سے ایک بیٹا بھی ہوا جن کا نام تھا ولی الدین خدابخش، اکثر اشعار میں جمیلہ نے ان کا ذکر کیا ہے۔

بچہ ہے اک مرا جو سگِ در ہے آپ کا
اس پر نگاہ لطف ہو بہر خدا علی

شاعر جب تک اپنے گردونواح اور حالات وکوائف کی عکاسی نہ کرے وہ ایک اچھا شاعر ہونے کے زمرے سے خارج مانا جاتا ہے۔ جمیلہ خاتون کبھی اپنے گردونواح اور دیگر مسائل زندگی کو اپنی شاعری میں پرونا نہ بھولیں جس کی مثال اوپر کے اشعار ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ انھوں نے لاکھوں اشعار نہیں کہے اور نہ ضخیم دواوین چھوڑے مگر ان کا خطی ذخیرہ خدابخش لائبریری میں موجود دستیاب ہے۔ ایک دیوان کی تصحیح بہار کے مشہور افسانہ نگار، مصنف اور شاعر شفیع مشہدی نے جس کو ''نغمۂ دل ریش از جمیلہ درویش'' کے عنوان سے 2003 میں شائع کرادیا۔ ریختہ سائٹ پر بھی بس یہی ایک دیوان دستیاب ہے اس کے علاوہ باقی خطی ہیں شفیع مشہدی نے بڑی جانفشانی سے اس کو ایڈیٹ کیا اور ایک مفصل مقدمہ بھی اس کے ساتھ تحریر کر کے شائع کیا جو جمیلہ خاتون کی شاعری اور ان کے حالات کو سمجھنے میں بڑا مددگار ہے۔ اسی میں جمیلہ خاتون کا ایک مختصر حال خود ان کے قلم سے ہے جس کا عنوان ہے ''خودنوشت سوانح'' اس میں بھی کچھ خاطر خواہ اطلاعات ملتی ہیں ان کے بارے میں۔

جمیلہ خاتون نے اپنا شعری ورثہ آٹھ دیوان اور دو مثنویوں کی شکل میں چھوڑا ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

1۔ جلد اوّل، ص149
2۔ جلد دوم، ص85
3۔ جلد سوم، ص116
4۔ جلد چہارم، ص155
5۔ جلد پنجم، ص105
6۔ جلد ششم، ص23
7۔ جلد ہفتم، ص39
8۔ جلد ہشتم، ص213
9۔ مثنوی احسن المطالب، ص49

جمیلہ خاتون کے یہ مختصر دواوین چند ہزار اشعار سے زیادہ نہیں مگر اس شاعرہ نے صاحب دیوان شاعرہ کے طور پر اور اپنی شعری انفرادیت کی وجہ سے شہرت پائی جو دیگر بہار کی شاعرات کو نصیب نہیں ہوئی۔ جمیلہ کی شاعری میں تصوف اور مذہب کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ حمد و نعت، منقبت اور مناجات کا سرمایہ کثیر تعداد میں ملتا ہے مگر اس کے علاوہ انھوں نے غزلیں اور نظمیں بھی کہیں جو مختلف موضوعات پر مبنی تھی۔ مثلاً گذشتہ صفحات میں لندن، شاد پر نظم یا قطعہ دعائیہ اشعار وغیرہ وہ ایک دیندار اور پاکباز عورت تھیں ان کی غزلوں میں بھی اکثر کسی نہ کسی شعر میں تصوف اور مذہب کا رنگ آ ہی جاتا ہے اور یہ فطری بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر غزل میں اگر معشوق اور محبوب کے حوالے سے محبوب کے حسن کے حوالے سے بات نہ ہو تو پھر غزل کا کیا مزا۔ وصال و فراق کا ذکر نہ ہو تو پھر کہاں کی غزل۔

باغ و گلشن و گلزار، چمن اور پھول اور خوشبو کا ذکر بھی کلاسیکل شاعری سے لے کر آج تک یہ مضامین شاعری میں باندھنا لازمی ہیں۔ غزل کا حسن نکھر آتا ہے اور دل میں ایک شادابی سی در آتی ہے۔ جمیلہ کے اس شعر کا مقابلہ مشکل ہے۔ انداز بے حد انوکھا ہے۔

ارے باغبان بھینی بو کی ہوں کلیاں
کہ سونگھے گی اک نازنین چھوٹے سن کی

درو بام و رہ گزر، دشت و سہرا کا ذکر بھی غزل کی حسن کی رعنائی کو دوبالا کر دیتا ہے۔

لگ گئی آخر نظر جاتا رہا حسن و شباب
منع تم کو کر رہے تھے بام پر جانے کو ہم
کون سے عیسیٰ کا گذر آج چمن میں
نرگس جو عصا تھام کے اٹھتی نظر آئی

لفظوں کا کئی دیگر معنوں میں ایک ہی شعر میں استعمال ملاحظہ ہو:

بے کلی بڑھ گئی ایسی کہ کل آئی نہ مجھے
یاد کل آئی جو اس بت کی کلائی مجھ کو

شراب وجام کا ذکر بھی ضروری ہے شعروں میں بھلے وہ شراب معرفت ہو، حقیقی یا شراب مجازی ہو:

شراب شوق کے پینے کا بندوبست ہے یہ
صراحی دل کو کریں چشم کو شسبو کرلیں

ان کی زلفوں میں اگر سوجاؤں
خواب دیکھوں گا اگر خواب پریشاں ہوگا

میرے گل پر میں سمجھتا ہوں پڑی اس کی نظر
آج گلشن میں صبا پھرتی ہے شرمائی ہوئی

کیا خواب میں دلبر سے ملاقات ہوئی
یا دل میں سمائی جو تھی وہ بات ہوئی

رخسار کے جلوے سے تو ظاہر تھا سحر
گیسو کو جو کھولا تو وہیں رات ہوئی

جمیلہ خاتون نے بت وکعبہ وبرہمن ومندر ومسجد مسلمان کے مضامین کو بھی اپنے اشعار میں برتا ہے:

دیا کرتے ہیں نسبت دل کو بیت اللہ سے شاعر
جمیلہ بت کہاں سے آگیا اللہ کے گھر میں

برہمن مجھ کو بناکر دل ہوا ہے ناخدا
مجھ کو ہندو کردیا اور خود مسلمان ہوگیا

مندر بنایا دل کو برہمن کے واسطے
مومن کے واسطے اسے مسجد بنا دیا

تلمیحات کا بھی ان کی شاعری میں خوب استعمال ہوا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

ہر شیفتہ یاں تیرا خریدار ہوا
جاں تجھ پہ فدا کرنے کو تیار ہوا

آمد سے تری یوسف ثانی میرے
محشر بھی عجب مصر کا بازار ہوا

بُنا ہے نور کا جامہ سیاہی، دست رحمت نے
اب اس پر آیت تطہیر کا پٹھا لگایا ہے

اے عشق جب خدائی کا دعویٰ ہے آپ کو
کعبہ بھی کوئی دوسرا تیار کیجیے

خاتون دل سے ہوتی ہے پیدا شب آرزو
دل ہو نہ جس کے پاس تمنا وہ کیا کرے

ہجر جاناں مدد کرے تو کرے
پوچھتا اس سے ہوں پتہ صاحب

شیدا نے تیرے خاک اڑائے ہیں دشت کے
تلوؤں میں ہیں چبھے ہوئے کیا خار دیکھیے

کس کی آمد ہے آج بام پہ جو
چاندنی اہتمام کرتی ہے

میری بے تابیوں پہ ہندوے شب
خوف سے رام رام کرتی ہے

زبان پہ مہر کردی ہے ہمارے عشق سرور نے
سب یہ آپ جاکر پوچھ لیجیے قیس عریاں سے

پھول مرجھا گئے ہیں دیکھ اس کو
آج بلبل بھی دل جلی سی ہے

غرض اس باکمال شاعرہ کے لیے خراج تحسین کا یہی ایک بہترین طریقہ ہے کہ اس کے تمام دواوین کو منظر عام پر لایا جائے مضامین لکھے جائیں شاعری کو پرکھا جائے سنا جائے اور سنایا جائے۔ اور اس قادرالکلام شاعرہ کو واقعی صاحبِ دیوان اور ایک منفرد شاعرہ ہونے کا جو شرف حاصل ہے وہ بجا ہے۔

منابع:

1۔ نغمۂ دل ریش از جمیلہ درویش: شفیع مشہدی، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ۔4

2۔ مقالات خدا بخش: خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ۔4

3۔ دیوانِ جمیلہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ۔4

□□□

Dr. Mehtab Jahan
Asst. Professor
Dept. of Persian
Delhi University
Delhi-110007
Mob: 9717412946

شاعرات کے منتخب اشعار

رنگ چہرے پہ گھلا ہو جیسے
آئینہ دیکھ رہا ہو جیسے

یاد ہے اس سے بچھڑنے کا سماں
شاخ سے پھول جدا ہو جیسے

نور جہاں ثروت

وحشت سی وحشت ہوتی ہے
زندہ ہوں حیرت ہوتی ہے

رہن نہ رکھ دینا بینائی
اس کی بھی مدت ہوتی ہے

عشرت آفریں

ہوا کے دوش پہ کس کے پیام آتے ہیں
ہمارے گھر کے در و بام مہکے جاتے ہیں

یہ زندگی وہ کڑی دھوپ ہے نسیم یہاں
نہ جانے کتنے ہرے پیڑ سوکھ جاتے ہیں

ملکہ نسیم

آداب ضبط عشق نہ رسوا کرے کوئی
اپنی بساط دیکھ کے سودا کرے کوئی

کیا طور ہر فراز سے اٹھے غبار شوق
وہ سوز اشتیاق تو پیدا کرے کوئی

نسیم سید

ادب سے دور ہٹ جائیں اندھیرے
ادا وہ سیکھنی ہے روشنی سے

درد بدن کے سب دل میں رہتے ہیں
اب اشکوں کے دریا الٹے بہتے ہیں

سکینہ ساجد پنہاں

ہوا کی تیزگامیوں کا انکشاف کیا کریں
جو دوش پر لیے ہو اس کے برخلاف کیا کریں

حمیرا اعتماد کا پہاڑ ڈھیر ہو گیا
اور اب بھی سوچتے ہیں ان سے اختلاف کیا کریں

حمیرا رحمان

ہوا سرکش اندھیرا سخت جاں ہے
چراغوں کو مگر کیا کیا گماں ہے

وہی بے فیض راتوں کا تسلسل
وہی میں اور وہی خواب گراں ہے

شہناز نبی

خواب آنکھوں سے زباں سے ہر کہانی لے گیا
مختصر یہ ہے وہ میری زندگانی لے گیا

دے گیا مجھ کو سرابوں کا سکوت مستقل
میرے اشکوں سے وہ دریا کی روانی لے گیا

عفت زریں

ڈاکٹر سرفراز جاوید

حجاب کا ناول 'ظالم محبت' رومانی فکر کا عکاس

حجاب امتیاز علی تاج اردو کی معروف فکشن نگار خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ان کی پیدائش 1915 میں حیدر آباد میں ہوئی۔ یوں تو ان کا آبائی وطن مدراس ہے۔ان کے والد سعید محمد اسمٰعیل نے نظام کی مملکت میں ملازم ہونے کے باعث حیدر آباد میں بودوباش اختیار کر لی تھی، مگر ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آبائی وطن مدراس میں رہنے لگے۔ان کی شریک حیات عباسی بیگم ایک ناول نگار تھیں۔ جو زبان و ادب سے حد درجہ دلچسپی رکھتی تھیں۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حجاب امتیاز علی تاج کی پرورش ایک باشعور، علمی اور فکشن نگار خاتون کی آغوش میں ہوئی، جن کو فکشن نگاری ورثہ میں ملی۔انھوں نے بہت سے افسانے اور تین ناول لکھے۔'ظالم محبت' (1940)، 'اندھیرا خواب' (1950) اور 'پاگل خانہ' (1980) میں لکھا۔انھوں نے امریکن ناولسٹ لوئزا مے الکوٹ (Louise May Alcott) کے ناول 'Little Women' کا اردو میں ترجمہ 'ننھی بیبیاں' کے نام سے کیا۔

حجاب کی تخلیقی نگارشات کا آغاز اردو ادب میں رومانوی تحریک کے ختم ہونے کے بعد ہوا۔ مگر حجاب پر رومانوی تحریک کے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ان کی تحریریں بھی رومانوی طرز فکر کی حامل ہیں۔اردو ادب میں رومانوی تحریک ایک طرح سے علی گڑھ تحریک کے اصلاحی اور مقصدیت پسند رجحان کے برخلاف وجود میں آئی، کیونکہ نئی نسل اپنے جذبات اور تخیلات کی آزادیٔ اظہار کی خواہاں تھی۔ چونکہ علی گڑھ تحریک کی فلسفیانہ، حقیقت پسندانہ، مقصدیت اور اصلاحی طرز روش میں، وہ آزادی کے ساتھ اپنے جذبہ و خیال کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔حالی نے اخلاقی مضامین اور نیچرل شاعری پر زور دیا، وہ اصلاحِ معاشرہ کے زبردست حامی تھے۔محمد حسین آزاد اور شبلی کی مقصدیت، عقلیت اور اصلاح پسندی سے بیزاری نے بھی نئی نسل کو تقویت بخشی۔ یہ حضرات زبان کے شعوری اور میکانکی استعمال کے برعکس تخلیقی زبان کے استعمال کے قائل تھے۔ جب ہم آزاد اور شبلی کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں جمالیاتی لطافت نظر آتی ہے۔

اردو زبان و ادب میں رومانوی طرز فکر مغربی ادب کے ذریعہ آئی، کیونکہ ہمارے علماء ادب نے مغربی ادبیات کا مطالعہ کیا تو، ان پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ مزید حالات کے پیش نظر اور ضرورت کے مطابق زمانہ کے ساتھ چلنا بھی بہت سے فوائد کا باعث بنتا ہے۔اسی کے پیش نگاہ مولانا محمد حسین آزاد بھی شاعروں کو مشورہ دیتے ہیں:

''صورت یہی ہے کہ ایشیا میں ایسے کمالوں کی رونق حکام کی توجہ سے ہوتی ہے۔ شاعروں کو چاہیے کہ اسے حاکموں کے

کار آمد یا ان کی پسند کے قابل بنائیں۔ایسا کریں گے تو شعر کہنے والوں کو کچھ فائدہ ہوگا۔اور جس قدر فائدہ ہوگا۔اسی قدر چرچا زیادہ ہوگا۔اسی قدر ذہن اور فکر وجودت کریں گے اور دلچسپ ایجاد اور خوش نما اختراع نکالیں گے۔اسی کو ترقی کہتے ہیں۔'

(ص۔141،آب حیات، برائے آزاد بکڈ پو کوچہ چیلان دہلی)

ہندوستان کی طرز معاشرت میں رفتہ رفتہ مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات مرتب ہو رہے تھے جو نئے اقدار اور ادبی رویوں کو پروان چڑھا رہے تھے۔وہ بعد میں ایک مضبوط طرز فکر کی صورت اختیار کر گئے۔ڈاکٹر محمد حسن اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''رومانوی تحریک اس بے نمکی کے خلاف احتجاج کی شکل میں سامنے آئی ،اردو ادب میں رومانوی تحریک کو کئی غیر متوقع وسائل سے مدد ملی۔اس سلسلے میں ٹیگور کی ماورائیت،اقبال کی روایت شکنی اور ابوالکلام کی انفرادیت خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔''(ص۔205،کلاسکیت اور رومانویت،علی جاوید)

رومانیت لفظ مفہوم کے اعتبار سے رومانس سے نسبت رکھتا ہے رومانس لٹریچر میں عشق ومحبت کی داستان وواقعات کی پیش کش ہوتی ہے۔ادب میں رومانویت کے بالمقابل کلاسکیت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔کلاسکیت میں اصول پرستی اور عقلیت پسندی کی قدروں کو پیش نگاہ رکھا جاتا ہے۔ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری رومانویت اور کلاسکیت کے مابین کچھ اس طرح افتراق قائم کرتے ہیں:

''کیونکہ رومانویت کی بلیغ ترین تعریف یہی ہے کہ جہاں کلاسیکی ادب منضبط معاشرہ کا تابع ہوتا ہے، وہاں رومانی ادیب شخصیت کے خوش گوار لب ولہجہ پر ایمان رکھتا ہے، مگر میری رائے میں ان دونوں قسم کے کارناموں کے درمیان جو امر سب سے بڑھ کر نمایاں حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ کہ کلاسیکی ادب عقل اور تسلیم شدہ نظریوں سے سروکار رکھتا ہے، اور رومانی ادب میں تمام تر زور احساس، وجدان اور جذبہ پر ہوتا ہے۔''

(ص۔58۔257،ادب اور تنقید،اسلوب احمد انصاری،سنگم پبلشرز،الہ آباد۔3)

رومانوی تحریک کا اردو ادب میں نمایاں پہلو یہ رہا کہ اس کے ذریعہ نسوانی طبقہ کی نمائندگی کھل کر سامنے آنے لگی۔دراصل رومانوی ادیب خواتین کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کرنے کے زبردست حامی تھے جس سے خواتین بھی معاشرے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ پیش قدمی کرسکیں۔

رومانوی تحریک کے ذریعہ اردو ادب میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، خاص طور سے اردو ناول میں مذہبی، سیاسی اور سماجی حالات کی تبدیلیاں، موضوعاتی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔رومانوی ادیبوں کے ناولوں میں طبقہ نسواں کے مسائل، مذہب بیزاری، نام نہاد مذہبی شخصیات پر طنز، کرب ناکی اور لاابالی رویوں کو موضوعات بنایا۔ان کے ناولوں میں زبان وبیان کے اعتبار سے نزاکت خیالی اور شعری انداز بیان پایا جاتا ہے۔رومانوی تحریک کے نمائندہ ادیبوں کا موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے یہی بانکپن ان کا طرۂ امتیاز ہے۔رومانوی تحریک کی پشت پناہی اور جلا بخشنے والے نمائندہ ادیبوں میں سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، لطیف احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری اور سجاد انصاری وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

حجاب امتیاز علی کا ناول 'ظالم محبت' رومانوی تحریک سے متاثر ہے۔جس میں رومانوی فکر کی غمازی بدرجہ اتم ہے۔اس ناول کے موضوعات، کردار نگاری، منظر نگاری اور خاص طور سے اسلوب بیان رومانوی طرز فکر کا عکاس ہے۔اس ناول کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔جس کی کہانی بتدریج اپنے سابقہ عنوان کی مناسبت سے 32 عنوانات کے تحت آغاز، وسط اور خاتمہ کو پہنچتی ہے۔اس ناول کے بزرگ اور سنجیدہ کرداروں میں دادی زبیدہ، ڈاکٹر گار اور چچا لوث ہیں۔جب کہ منیر جسوتی، منصور اور روحی نوجوان کردار ہیں۔خاندانی طرز معاشرت کے مطابق بزرگوں کے فیصلے کی رو سے منیر اور جسوتی ایک دوسرے سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ناول کے کرداروں میں بزرگ حضرات اپنے جذباتی لگاؤ کی خاطر اپنی مرضی سے منیر اور جسوتی کا رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ہاں جسوتی کو منیر سے منسوب ضرور کر دیا جاتا ہے مگر وہ تو منصور کو چاہتی ہے۔وہ خاندانی شرافت کے باعث بزرگوں کے فیصلے کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔اسی نسبت سے ناول نگار نے اس ناول کا نام 'ظالم محبت' رکھا ہے۔اس ظالم محبت کے راز کا ایجاز واجمال یہ ہے کہ دادی زبیدہ پوتے منیر کی خاطر، یتیم خانہ سے رفیق کار کے طور پر منصور کا انتخاب کرتی ہے۔تو منصور اپنی خوب صورتی، حسن اخلاق اور حکمت ودانائی کے برتے پر یتیم خانہ سے محل میں منتقل ہو جاتا ہے۔جب وہ محل میں قیام پذیر ہوتا ہے تو منیر اور منصور میں زبردست قربت والفت پیدا ہو جاتی ہے۔وہ دونوں بزرگوں کی رضامندی سے انگلستان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔وہ دونوں انگلستان میں تیرہ سال رہنے کے بعد محل میں واپس آجاتے ہیں۔منصور اپنی لیاقت

اور استعداد کے باعث ایک قابل ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے کیونکہ جسوتی اور منصور باہم ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں ۔تاہم گھر کے بزرگوں کے فیصلے کے سامنے مجبور محض ہیں۔ منصور بزرگوں کے احترام کی خاطر جسوتی کو چاہنے کے باوجود اسے منیر کی منگیتر تسلیم کر لیتا ہے۔ مگر خود محبت کی آگ میں تڑپ کر دق کے موذی مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ موت سے قبل مالیخولیا یعنی دماغی خلجان کے باعث ہذیانی کیفیت میں منیر کے سامنے جملہ صورت حال کو بیان کر دیتا ہے۔ منیر بھی اس صورت حال سے واقف ہو کر اپنے انسانی اور برادرانہ جذبہ کو بروئے کار لا کر منصور کی خاطر اپنی منسوبہ کا ایثار کرنا چاہتا ہے۔ مگر منصور اس گھر اور منیر کی احسان سپاسی کے لیے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ اس طرح ناول کی یہ کہانی ایک المیہ کا منظر پیش کرتی ہے۔

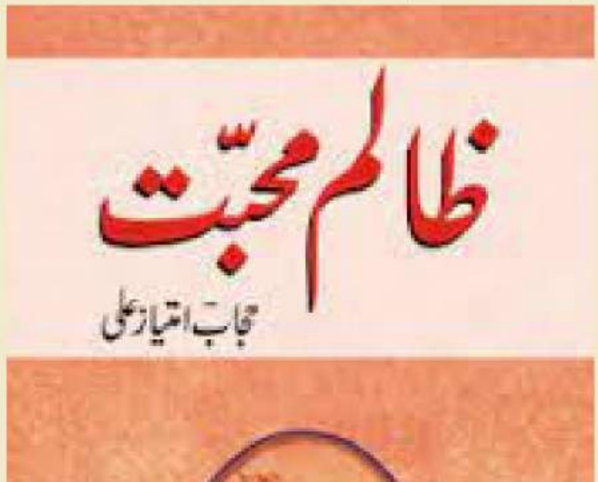

ناول نگار نے 'ظالم محبت' کی کہانی کو بیان کرنے میں رومانوی فکر کا بڑا برمحل استعمال کیا ہے، کیونکہ کرداروں کی کارکردگی کے تمام معاملات میں ان امور پر غور کیجیے جو کرداروں کے سراپے، نشست و برخاست، بناؤ سنگھار اور مناظر سب رومانوی فکر کے حامل ہیں۔ ناول کا یہی اسلوب اس کو رومانی فکر میں اہم مقام عطا کرتا ہے۔ حجاب نے یوں تو ناکام محبت کو اس ناول کا خاص موضوع بنایا ہے۔ مگر جب یہی موضوع عشق و محبت کے رومانوی اسلوب میں قاری کے سامنے آتا ہے تو قاری ناول کی اس المناک کہانی کی بنت اور پیش کش پر غور و فکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ناول نگار کی رومانوی طرز فکر میں کرداروں کی حلیہ نگاری اور سراپا نگاری سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ناول کے کرداروں کے جملہ اوصاف ان کے حلیہ اور سراپے میں واضح طور پر عیاں ہوتے ہیں۔ ناول کی عمر رسیدہ کردار، دادی زبیدہ کے سراپے پر توجہ دیجیے:

> ”کتب خانے کے رنگین شیشوں والے دریچے سے ماہ مارچ کی گرم اور چمک دار دھوپ دادی جان کے سنہرے بالوں پر پڑ رہی تھی۔ انھوں نے ایک سیاہ جالی کا رومال سر پر لپیٹ رکھا تھا، کانوں میں سونے کی بالیاں متحرک تھیں اور گلے میں سراندیپ کے موتیوں کی سبک سی مالا پڑی تھیں۔“
> (سفر، ص۔15، ظالم محبت، حجاب امتیاز علی)

یہ اقتباس ایک بوڑھی عورت کی نفسیات کو پیش کرتا ہے۔ جس کو حسن و زیبائش کے شوق کے ساتھ زندگی جینے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ عموماً اس طرح کا سراپا و حلیہ ان بوڑھی عورتوں میں دیکھنے کو ملتا ہے جو مزاج اور طرز فکر کے اعتبار سے رومانی ہوتی ہیں۔ ناول نگار عمر رسیدہ دادی زبیدہ کے سراپا کا مبالغائی انداز میں کیا خوب خاکہ کھینچتی ہیں:

> ”وہ ایک مغرور انداز سے باتیں کر رہی تھیں۔ اور ان کی صراحی دار گردن میں پکھراج کا بیش قیمت ہار آفتاب کی طرح جگمگا رہا تھا۔“ (کھانے کی میز پر، ص۔30، ایضاً)

ناول نگار نے اس کہانی میں المناک انجام سے دوچار ہونے والے کردار منصور کی قد و قامت اور حسن و جمال کی شخصیت کا ظاہری خاکہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ”آنکھوں نے ایک عجوبہ محسوس کیا۔ بلند و بالا قد، گلابی رنگ، گہری نیلی اور شوخ مسکراتی ہوئی آنکھیں چمک دار نارنجی رنگت کے بال جیسے ڈوبنے والے سورج کی باریک سنہری کرنیں، ستواں ناک، واضح ٹھوڑی، غرض یونانیوں کے حسن و عشق کا مرمریں دیوتا! ایسا حسن مری نظر سے نہ گزرا تھا۔“

(نگاہ اولین، ص۔23، ظالم محبت)

مذکورہ بالا اقتباس اس بات پر دال ہے کہ ناول نگار اس سے بخوبی واقف تھیں کہ یونانی معاشرہ میں حسن و جمال کا کیا تصور تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے منصور کے حسن کی تشبیہ یونانی دیوتا سے دی ہے۔ یعنی منصور کا کردار

جسمانی ساخت کے اعتبار سے حسن و جمال کا پیکر اور جاذب نظر تھا۔ ہاں منیر اس کے بالمقابل اتنا خوب صورت جذب و کشش کا پیکر نہیں ہے۔ اسی لیے ناول نگار اس کے سراپے کے تعلق سے بڑے اختصار سے کام لیتی ہیں:

> ''مسہری کے رنگین اور مہین پردوں میں منیر کا خوب صورت چہرہ سرسوں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ وہ بالکل مشرقی افسانوں کے نازک مزاج معشوق صفت ہیروں کے خدوخال رکھتے تھے۔'' (نگاہ اولین، ص۔20، ایضاً)

ناول نگار کو کسی بھی واقعہ، منظر اور چیز کے بیانیہ پر قدرت حاصل ہے۔ وہ جب منظر نگاری سے کام لیتی ہیں تو وہ اسے کمال فن کاری سے الفاظ کے پیکر میں کچھ اس طرح ڈھالتی ہیں کہ قاری کے سامنے اس کی تصویر ابھر جاتی ہے۔ وہ جب کسی خوب صورت واقعہ کی منظر نگاری اپنے دلکش اور متاثر کن الفاظ کے ذریعہ کرتی ہیں تو رومانوی انداز بیان کیا خوب محسوس ہوتا ہے۔ آپ بھی مندرجہ اقتباس کی دلکشی پر غور کیجیے:

''وہ مشرقی ممالک کی ایک نہایت حسین رات تھی۔ بالکل ایسی ۔۔۔ جیسے کہانیوں میں ہوتی ہے۔ تاریک باغ کے تن آور تاڑ کے درختوں پر کسی نامراد اور عاشق کے چہرے کی طرح پیلا چاند اب چمکنے لگا تھا۔ باغ کے آخری حصہ سے ناشاد بلبل کی میٹھی نغمہ سرائی سنائی دے رہی تھی۔ ہواؤں میں زرد لیموں کی کلیوں کی نکہت ملفوف تھی اور گرم ممالک کے آسمان پر سیارے بڑی تیزی سے جگمگا رہے تھے۔''

(رات کے سناٹے میں، ص۔53، ایضاً)

حجاب کسی بھی فضا و ماحول اور واقعہ کی منظر نگاری کے ساتھ افسردگی کے مناظر میں اپنے کمال فن سے ایسی تصویر کشی کرتی ہیں، جس کو قاری نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اپنی آنکھ کی بصارت و بینائی میں اترتی ہوئی تصویر دیکھتا ہے۔ چند افسردگی کے منظر پر غور کیجیے:

> ''آسمان پر بھورے رنگ کے بادل جمے ہوئے تھے۔ آفتاب بیمار سا نظر آتا تھا۔ ہوائیں سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ سمندر میں تلاطم تھا۔'' (اقرار، ص۔77، ایضاً)

> ''میرے سامنے صنوبر کا ایک بلند و بالا درخت مارے غصے کے زور زور سے کانپ رہا تھا۔ میں موجودہ حالات پر غور کرتی ہوئی، چپ چاپ کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد جھک کر دیکھا، تو قصر عشرت کی دیواروں تلے دریائے شون ایک غصیلے ناگ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔''

(ایک عجیب خبر، ص۔85-86، ایضاً)

''دریچے کے باہر کالے آسمان نے اپنے تاروں کی دولت بکھیر رکھی تھی۔' میں دیر تک بھاری دل سے تاروں کی اشک آلود آنکھوں کو تکتا رہا۔ میری روح میں دردانگیز خلا تھا، روتے ہوئے تاروں کو دیکھنے سے اس کا درد بڑھتا جا رہا تھا'' (ص۔203، ایضاً)

ناول نگار نے بالا تحریر میں کائناتِ فطرت کے چند مناظر کی خوب تصویر کشی کی ہے، جس میں افسردگی چھائی ہوئی ہے مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ناول نگار دریچے کے باہر کالے آسمان نے، کالے آسمان کے تعلق سے کہیں ذکر نہیں ملتا۔ عموماً نیلے آسمان کا ذکر ملتا ہے۔

حجاب نے رومانوی فکر کو اپنے ناول میں الفاظ کا پیکر عطا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ ان کے ناول میں منظر نگاری کا ہر بیان بڑا دلکش اور پرکشش ہوتا ہے جو قارئین کے دلوں کو موہ لیتا ہے۔ ان کے ناول میں کرداروں اور علاقوں کے نام بھی بیشتر رومانوی فکر کی چغلی کھاتے ہیں۔ کرداروں میں چمپا، چنبیلی اور علاقوں کے تعلق سے کوہ الماس، دریائے ناسپاس کا ساحل اور جزیرۂ عباس وغیرہ۔

حجاب نے یوں تو اپنے ناول میں جگہ جگہ بڑے تاثر آمیز انداز بیان کے ذریعہ واقعات کی بہتر تصویر کشی کی ہے۔ وہ تخلیقی کمال فن سے کیا خوب پیکر تراشتی ہیں۔ ان کی تحریر کی دلکشی پر غور کیجیے:

> ''منصور بدستور اندھیرے میں زینے پر کھڑے، چاند کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ نیچے نہر کے پانی میں ہوا سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی اور چاند کی نورانی شعاعیں، اس میں منعکس ہو رہی تھیں۔ رات اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ جلوہ گر تھی۔

(رات کے سناٹے، ص۔56، ایضاً)

وہ دل میں عشق و محبت کے ابھرنے والے نشیب و فراز کی نفسیاتی کیفیت کو خوب سمجھتی ہیں۔ وہ کسی شخص پر عشق و معاشقہ کی زہرناک کیفیت کے اقدام کے باعث وقوع پذیر ہونے والے معاملات کا روحی کی زبان سے کیا خوب بیان کرواتی ہیں:

> ''میرے ہونٹوں سے ایک آہ نکل گئی، دعا کے پیرایہ میں کہ ۔۔۔ اے عشق! نسوانی خودداری کو اس طرح آزمائش میں نہ ڈال۔ یہ سچ ہے کہ تیرے آہنی ہاتھوں نے شہنشاہوں کے جگمگاتے ہوئے تاج چکنا چور کر دیے مگر ایک بے بس مظلوم لڑکی پر رحم کر! آہ ظالم محبت!''

(افسانے کا پلاٹ، ص۔76، ایضاً)

ناول کا اہم کردار منصور جو شرافت ،سماجی احترام اور نسبتوں کے باعث اپنی محبوبہ کے غم میں مبتلا ہو کر مرض دق کے باعث جاں بحق ہو جاتا ہے۔ وہ مشرقی تہذیب وتمدن کا پاس دار ہے۔ ناول نگار بھی معاشرتی عزت واحترام کی خاطر محبوب اور عزیز واقارب کو رسوائی سے محفوظ رکھنے کے لیے جسوتی کو معاشرتی حدود وقیود کی پابند رہنے کے لیے، کیا خوب دعائیہ کلمات ایک کردار کے ذریعہ پیش کرتی ہیں:

''محبت! آہ ظالم محبت! اس کی خودداریوں کو پامال نہ کر۔ ستم رسیدہ آدمی جب محبت کے جنجال میں پھنس جاتا ہے تو وہ رواج کے آہنی قانون کو بھی توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ یہ بے پناہ طاقت اس میں پیدا نہ کر۔ اس کے کمزور دل کو کمزور ہی رہنے دے۔ اس کے نازک ہاتھوں کو محبت کی خوف ناک زنجیروں سے الجھنے کی جنونی قوت عطا نہ کر۔ وہ ایک مشرقی مظلوم لڑکی ہے! اس سے وفور دیوانگی میں کوئی ایسی حرکت سرزد نہ کرا۔ جس سے اس کا شیشۂ نخوت ٹکرا کر چور ہو جائے!''

(واپسی،ص۔137،ایضاً)

جسوتی جب اس سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتی ہے تو منصور پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اسی حالت وکیفیت میں وہاں سے جسوتی کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ناول نگار نے اس وقت کا نقشہ الفاظ کے پیکر میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

''وہ نازنین شمع سنبھالے ہوئے رخصت ہوگئی لیکن میری روح میں...حرماں نصیب روح میں اپنی شمع کی لو سے زیادہ دہکتا ہوا انگارہ رکھ گئی۔ ایک عورت زبان کھولے بغیر اپنی محبت کے متعلق جو کچھ بھی کہہ سکتی تھی وہ کہہ گئی۔ آہ! بدنصیب لڑکی!۔۔۔اسے اپنے منسوب منیر سے نہیں۔۔۔مجھ سے محبت ہے۔ مجھ مجبور اور نامراد شخص سے۔۔۔میری تقدیر میں صرف اپنی نامرادی ہی کا درد نہیں۔۔۔اس احساس کا کرب بھی شامل ہے کہ میری محبوبہ خود مجھے چاہتی ہے۔ مالک! جب میں نے اپنے لئے خود اذیت کا راستہ پسند کر لیا تھا تو پھر آزمائش کی یہ نئی عقوبتیں مجھے کیوں بخشی جارہی ہیں۔ میری روح انتہائی کرب میں مبتلا تھی۔ کہ اس میں ایک آتش کدہ آباد کرنے کے لئے یہ خیال بھی چٹکیاں لے رہا تھا کہ خاتون جسوتی خود مجھے چاہتی ہیں۔۔۔آہ یہ فردوسی خیال...مجھے جہنم کی آگ میں جلا رہا تھا۔ محبت صرف اپنے دل میں ہو۔ تو اس کا گلا گھونٹا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں محبوب کی محبت کا بھی علم ہو۔۔۔تو بے بس انسان آخر کیونکر جیئے؟''

(نگاہ اولین،ص۔196،ایضاً)

حجاب امتیاز علی تاج انسانی نفسیات کے پیش نظر کرداروں کے حالات وکیفیات کے مطابق شعر بھی نقل کرتی ہیں۔ جسوتی کی منصور کی محبت کے باعث ایسی کیفیت ہو جاتی ہے۔ جس میں اس کو اپنا سب کچھ لٹا ہوا نظر آتا ہے تو وہ روحی کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار یہ شعر سنا کر کرتی ہے:

'سبھوں نے پھیرلیں آنکھیں وفا کہیں نہ رہی
فلک، فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی'

(ص۔80،ایضاً)

حجاب کو عشق ومحبت کے لطیف جذبات واحساسات کی ترجمانی کا زبردست ملکہ حاصل ہے۔ انھوں نے ناول کے بین السطور جگہ جگہ خارجی حالات کو بھی کمال فن کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ معاشرتی رسوم وآداب کے حامل کرداروں کی جذباتی پیش کش بحسن خوبی کرتی ہیں۔ ان کے مکالمے بھی برمحل ہیں۔ ناول میں عشق ومحبت کی فضا کی منظر کشی کچھ ایسی ہے کہ اس میں ذہنی کشمکش اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ آخر میں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ مجموعی طور پر یہ ناول موضوعاتی، کردار نگاری، تکنیکی اور اسلوبیاتی سطح پر رومانوی فکر کا عکاس ہے۔ مگر ہاں اس کا رومان بڑا سوگوار ہے، کیونکہ ناول کے ہیرو منصور اور ہیروئن جسوتی کی کہانی ایک ناکام محبت کے المیہ پر ختم ہوتی ہے۔ منصور کی وفات کے بعد منیر، ڈاکٹر اور جسوتی اس کی لاش کے قریب کچھ اس حال میں نظر آرہے تھے:

''بھیا منیر لاش پر گر کر بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگے۔ ڈاکٹر گار آنسو بہاتا ہوا سرہانے ہاتھ مل رہا تھا۔ میرے آنسو میرے قابو میں نہ رہے تھے جسوتی چپ چاپ منصور کے چہرے کو ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی تھی جس پر حسن اب بھی ہزار جان سے فدا ہو رہا تھا۔''

(تن مریض میں دم کا شمار باقی ہے، ص۔256،ایضاً)

□□□

Dr. Sarfaraz Javed
R-155,Gali No- 6,
Sir syed Road
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

ڈاکٹر راشد میاں

اختر شیرانی کی شاعری میں نسائی حسیت

اردو ادب میں اختر شیرانی نہ صرف شاعر بلکہ صحافی، محقق، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور لغت نگار کی حیثیت سے بھی معروف تھے لیکن ان کی اصل شناخت اور شہرت کا دارومدار ان کی رومانی شاعری ہے۔ انھیں 'شاعر رومان'، 'شہزادۂ رومان' اور 'رومان کا شیکسپیئر' جیسے القابات سے بھی نوازا گیا۔ جہاں جوش ملیح آبادی نے فرمایا:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب

وہاں اختر شیرانی یوں نغمہ زن ہوئے

رومان و محبت مشغلہ ہے میرا بچپن سے

ان کی شاعری میں نسائی حسن و شباب، رقص و نغمہ، عشق و الفت، ہجر و یاس، مے و ساقی، نور و سرور، نغمۂ شادی اور نوحۂ غم، رنگینی و رعنائی، بہار و خزاں جیسے موضوعات جا بجا موجود ہیں۔ انھوں نے شاعری میں افادی پہلو، الفاظ کی گہرائی و گیرائی پر زیادہ توجہ نہ دی۔ ان کے مطابق شاعر کا کام دنیا اور زندگی کے حسن کو دنیا کے سامنے منعکس کرنا ہے، زندگی کے ناسوروں کی جراحی شاعر کا کام نہیں۔ 1942 کی ایک ریڈیائی تقریر میں انھوں نے خود فرمایا:

"میرے نزدیک شاعر کے لیے اپنے آپ کو کسی سیاسی یا اقتصادی نظام سے وابستہ کرنا ضروری نہیں۔ وہ نظام سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، جمہوریت ہو یا فاشیت، شاعر کے لیے ان میں سے ایک بھی قابل توجہ نہیں۔ شاعر کی قدریں ان سب سے الگ اور آزاد ہیں۔"

(بحوالہ کلیات اختر شیرانی، 2003، فرید بک ڈپو، دہلی، ص 12)

حالانکہ اختر شیرانی رومانی شاعری کے سرخیل ہونے کے باعث اشتراکی و دیگر نقادان ادب نے ان کی عظمت شاعری کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کیا۔ اختر شیرانی کے مشہور شاگرد و شاعر احمد ندیم قاسمی نے اس حقیقت کو اس انداز میں واضح کیا ہے کہ:

’’حق بات یہ ہے کہ اختر شیرانی کی شاعرانہ خصوصیات کا غیر مشروط اعتراف کیے بغیر اردو شاعری کی سچی تاریخ مرتب ہی نہیں ہوسکتی۔ یقیناً اختر کی وفات کے بعد ہمارے نقادوں نے اس بے مثال شاعر سے گناہ کی حد تک بے اعتنائی برتی مگر عالمی تاریخ شعر پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ خالص کی پہچان میں بعض اوقات ذرا زیادہ مدت گزر جاتی ہے...... مجھے یقین ہے کہ اختر کی انفرادی عظمت کے اعتراف کا وقت بھی دیر یا بدیر آئے گا۔‘‘

(بحوالہ مطالعہ اختر شیرانی: مختار ٹونکی، ص 45)

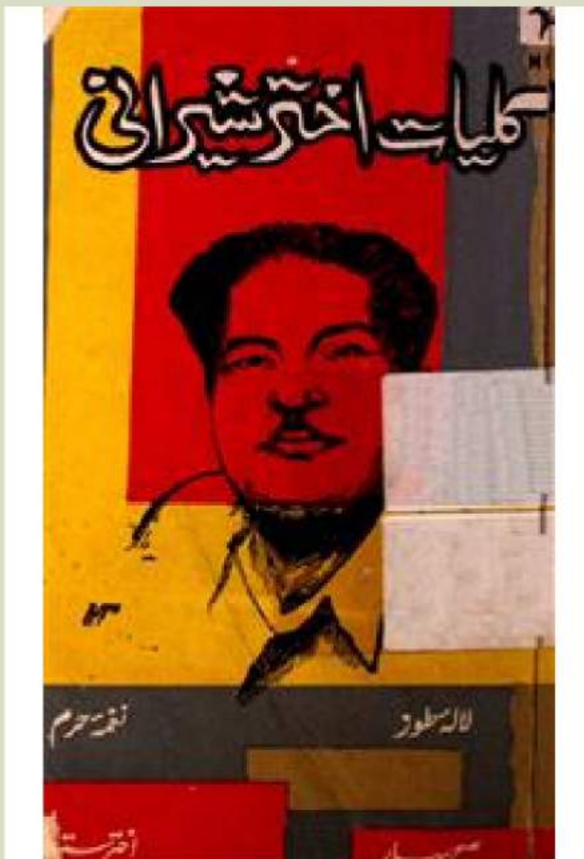

ادب اطفال کے ضمن میں جہاں اختر کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ بچوں کے لیے مجموعہ منظومات ’’ پھولوں کے گیت‘‘ دارالاشاعت پنجاب لاہور سے 1936 میں شائع کرایا، وہیں نسوانی ادب کے اعتبار سے وہ اردو کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے اردو شاعری میں واضح طور پر عورت کو باقاعدہ مختلف حیثیتوں سے پیش کیا۔ اس سے قبل اردو کی بیشتر کلاسیکی شاعری میں امرد پرستی کا رجحان عام تھا۔ کئی بڑے اور عظیم غزل گو شعرا کے یہاں بھی معشوق کی جنس مذکر شناخت کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ ریختی کی طرح بعض برساتی ملہار رس کے گیت اور برساتی چار بیت وغیرہ میں تو تخاطب عورت سے مرد یا شوہر کی جانب ہونے سے عاشق و معشوق کی جنس شناخت ہونے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اختر سے قبل کے شعرا میں بیشتر محبوب سے حسن و عشق اور لگاوٹ کی باتوں کے ساتھ اس کے ناز، غمزۂ و ادائے دلفریب کا ذکر تو دل کھول کر کرتے ہیں تو بعض شعرا عریانیت کے دائرے تک بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن اپنے معشوق کا نام اظہار کرنا تو کجا اس کا حسن ظاہر کرنے میں بھی وہ ندامت محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح یہ شعرا محبوب سے دل کی گہرائیوں سے محبت کا دم تو بھرتے ہیں لیکن معشوق کے حسن کا اظہار ان کے لیے باعث شرم ہے۔

اردو کی عشقیہ شاعری میں اختر شیرانی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے بلا خوف و تردد نہ صرف اپنے معشوق کے مؤنث ہونے کو ظاہر کیا بلکہ بے باکانہ طور پر اپنے معشوق کو مؤنث افعال، صفات اور ناموں سے خطاب کر زیب و زینت بخشی۔ اس ضمن میں بزرگ محقق مختار ٹونکی کا بیان ہے:

’’ ہمیں لازمی طور پر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو ’عورت‘ سے روشناس کرایا۔ اختر شیرانی سے پہلے اردو کی تمام عشقیہ شاعری میں معشوق جنس ذکور کی صورت میں نظر آتا ہے اور زیادہ تر امرد پرستی کے جذبات غزل کے پیرائے میں منظوم ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ اچھے اچھے غزل گو شعرا نے معشوق کا ذکر مذکر فعلوں میں اور مذکر صفتوں کے ساتھ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تاویلیں پیش کی جاسکتی ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ ہماری تہذیب میں برملا عورتوں کا ذکر کرنا اور نام لینا تک شرم و حیا کے منافی ہے۔ اس لیے شعرا نے شرافت و غیرت کو ملحوظ رکھا۔ مگر اختر شیرانی نے اپنے واشگاف عشق کا اظہار کیا اور کھلم کھلا محبوب کے حسن و جمال کا عشق کا بیان کیا۔ انھوں نے ہماری شاعری کو نسائی کرداروں سے آراستہ و پیراستہ کر کے عروس سخن کو اس کے فطری حسن کے ساتھ پیش کیا۔ ان کا محبوب ماورائی نہیں، بلکہ ارضی ہے، وہ تخیلی نہیں، حقیقی ہے، اس لیے انھوں نے نسوانی وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی شاعری کی داغ بیل رکھی جس میں عورت اپنی تمام تر رعنائیوں اور دیدہ زیبیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ مونث الفاظ اور اسما کو استعمال کرتے ہوئے انھوں نے اعلانیہ طور پر کہا کہ:

بہار حسن کا تو اک پیکر شاداب ہے سلمیٰ

اور اس پیکر شاداب کی نسوانی کیفیات کو اپنے شعروں میں سمو دیا۔ سلمٰی سے دل لگا کر وہ بستی لڑکیوں میں بدنام بھی ہوئے لیکن اردو شاعری کو ایک نئی قبا عطا کر گئے۔ اختر شیرانی سے پہلے کسی شاعر نے اس طرح کھل کر نہیں کہا تھا کہ:

خدائی کہکشاں کہتی ہے جس کو
وہ سلمٰی کا خرام رائیگاں ہے
حریم حضرتِ سلمٰی کی سمت جاتا ہوں
ہوا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کرلوں گا۔"

(مطالعہ اختر شیرانی، 2012ء مختار ٹونکی، ص 20)

اختر شیرانی نے اپنا اولین شعری مجموعہ "پھولوں کے گیت" کے عنوان سے منظومات برائے اطفال کے طور پر 1936 میں ترتیب دیا تھا۔ دوسرا شعری مجموعہ "نغمۂ حرم" کے عنوان سے 1939 میں مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں خواتین سے متعلق کئی لافانی نظمیں ہیں، بعض منظومات اطفال سے متعلق ہیں۔ اختر کی شاعری میں عورت کا تصور کسی بے مروت، بے وفا یا ہرجائی کا نہیں۔ اسی طرح ان کی محبوبہ کوئی آسمانی، تخیلی پری زاد، یا خلا بازی یا حور بہشت نہیں بلکہ وہ اسی کرہ ارض سے تعلق رکھنے والی شرم وحیا، حجاب وعصمت، مہر ووفا، اور فطری حسن کا پیکر ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری میں خواتین کی وقعت وعزت کا ذکر کئی طور سے بارہا کیا گیا ہے۔ ناصر خان کے زیر اہتمام فرید بک ڈپو، دہلی کے ذریعہ 2003 میں شائع شدہ 'کلیات اختر شیرانی' میں 'عورت' کے عنوان سے دو نظمیں شامل ہیں، ان منظومات میں شامل اشعار سے ان کا تصور عورت، اس جہان رنگ وبو میں عورت کی اہمیت وعظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک اس جہاں کی شان ورونق عورت ہی سے ہے۔ وہ بنا لشکر ہی پوری دنیا پر بادشاہت کرتی ہے، وہ نہ ہوتی تو دنیا نہیں چلتی غرض ان کے مطابق ہماری پوری عمر اور حیات پر عورت کی خدائی کا سکہ چلتا ہے۔ منظومات سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں

(1) عورت 'فنون لطیفہ کی دنیا میں'

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے
مصور کی نظر میں اس کی تصویریں پریشاں
ادب کی محفلوں میں اس کی تنویریں پریشاں ہیں
حسین اور خوشنما اشعار، شاداب اس کے نغموں سے
ہمارے بربطوں کے تار ہے خواب اس کے نغموں سے
بتوں کے مرمریں پردوں میں رنگت اس کی آوارہ
غرض جب تک یہ دنیا اور اس کی خوشنمائی ہے
ہماری زندگانی بھر یہ عورت کی خدائی ہے

(2) عورت

حیا وحرمت ومہر ووفا کی شان ہے عورت
شباب وحسن وانداز وادا کی جان ہے عورت
حجاب وعصمت وشرم وحیا کی کان ہے عورت
جو دیکھو غور سے ہر مرد کا ایمان ہے عورت

اسی طرح ان کی نظم "کلوپیڑا" میں بھی عورت کی تصویر پریشاں کا ذکر کیا گیا ہے:

وادئ نیل پہ طاری تھا بہاروں کا سماں
محو پرواز تھا رنگین ستاروں کا سماں
مائلِ رقص ہو جس طرح شراروں کا سماں
دیکھتے دیکھتے نیرنگ نظارہ ٹوٹا!
جلوۂ فطرت رنگیں کی تھی تنویر اس میں
ایک عورت کی پریشان تھی تصویر اس میں

نظم "بیوی کا شوہر کے نام پہلا خط" میں ایک نو عروس کے نسوانی جذبات واحساسات کا دلکش اظہار ہوا ہے، نظم میں زبان وبیان نہایت شیریں ودلچسپ ہے:

احوال دل لکھوں؟ خلش مدعا لکھوں؟
رکتی ہوں لفظ لفظ پہ آخر میں کیا لکھوں؟
دل اپنی دھڑکنوں کو چھپا پائے کس طرح
پہلے پہل کا خط ہے لکھا جائے کس طرح
لکھنے کو تو میں لکھتی ہوں تم کو ہزار خط
لکھ لکھ کے پھاڑ دیتی ہوں بار بار خط
گستاخی کا خیال گر آئے تو کیا کروں؟
دل شرم سے جو بات دبائے تو کیا کروں؟
کر جائے گا خفا کہ ہنسا جائے گا یہ خط
اللہ! کس نظر سے پڑھا جائے گا یہ خط
پہلے پہل کے خط میں، کیا ماجرا لکھوں
کہہ دوں "یہ کیا لکھا ہے؟ میں کہتی ہوں "کیا لکھوں"
طاری جو اک ہجوم خیالات دل پہ ہے
اک ہات میں قلم ہے تو اک ہات دل پہ ہے

اس جہان رنگ وبو میں مرد اور عورت مختلف حیثیتوں سے رشتوں

میں بندھے ہیں۔ عورت ایک جانب معشوقہ و بیوی کے روپ میں ہے تو دوسری جانب بہن، بیٹی اور ماں جیسے مقدس رشتے میں بھی وہ جلوہ افروز ہے۔ شاعر بھی سماج ہی کا ایک فرد ہے، ایک حساس ذہن کا شاعر ان رشتوں کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اختر شیرانی کی نسوانی شاعری میں صرف نسوانی حسن و جمال اور رنگت و نور و ادا کی عکاسی ہی نہیں، خواتین سے متعلق مختلف تقاریب مقدسہ (شادی، سہرا، رخصتی، عبادت وغیرہ) کا ذکر و تفصیل ان کی شاعری و منظومات میں موجود ہے۔'' ایک شاعرہ کی شادی پر''، ایک عزیزہ کی شادی پر'' صحنک'' وغیرہ اس نوعیت کی قابل ذکر منظومات ہیں۔ مذکورہ منظومات سے اخذ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے کہ تھا اُنس تجھے عشق کے افسانوں سے
زندگانی تری آباد تھی رومانوں سے
شعر کی گود میں پلتی تھی جوانی تیری
تیرے شعروں سے ابلتی تھی جوانی تیری
شرکت غیر سے بیگانہ تھے نغمے تیرے
عصمت حور کا افسانہ تھے نغمے تیرے

(ایک شاعرہ کی شادی پر)

نوید رحمت پروردگار بن کے رہو
برنگ سایۂ نخل چنار بن کے رہو
تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو
ستانے پائیں نہ افکار، اس جہاں کے تمھیں
کریں ملول نہ آزاد آسماں کے تمھیں
نزیل سایۂ پروردگار بن کے رہو
سعادتیں ہوں میسر جہان نو میں تمھیں
نصیب برکتیں ہوں، گلستان نور میں تمھیں
برنگ دامن ابر بہار بن کے رہو

(ایک عزیزہ کی شادی پر)

اختر شیرانی کو اپنی شاعری نیز دیگر نثری تحریروں میں نسوانی اسماو افعال سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ انھوں نے بیک وقت کئی قلمی نام اختیار کرتے ہوئے کئی تحریریں قلمبند کیں۔ ان میں بالم، کوکب، اور راج کماری، بکاؤلی جیسے نسوانی اسما بھی شامل تھے۔ یہاں تک کہ بعض پرندوں کے نسوانی اسما بھی انھیں مرغوب ہیں۔ ''تیتری'' اور'' ایک تنہا مرغابی'' کے عنوان سے جو منظومات انھوں نے کہی ہیں وہ ذکر شدہ'' کلیات اختر شیرانی''، میں شامل ہیں۔

اختر شیرانی کی شاعری میں خواتین اسما سلمیٰ، ریحانہ شیریں اور عذرا وغیرہ سے متعلق کئی منظومات موجود ہیں بالخصوص سلمیٰ کا ذکر ان کی شاعری میں بار ہا کیا گیا ہے۔ سلمیٰ کو بعض محقق حضرات نے اختر کا ایک تخیلی پیکر، جمال ذہنی اور مجسمہ حسن وغیرہ بتایا ہے تو بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ اختر شیرانی کے یہاں سلمیٰ کا وہی مقام ہے جو کیٹس کے ہاں فینی بران، امرا القیس کے ہاں،، ورڈس ورتھ کے ہاں لوسی کا ہے۔ اختر کے نزدیک سلمیٰ'' دیار ناز کی اک ساحرہ'' اور جہان قدس کا ایک نورانی فسانہ ہے۔ اس ضمن میں اپنی نظم 'سلمیٰ' میں چند اشعار سے اس کا تعارف اختر نے اس طرح کروایا ہے۔

بہار حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دست رنگیں سے سنوارا ہے
بہشت رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکر مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستان جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحر حسن فطرت کا کنارہ ہے
تو اس سنسار میں اک آسماں ہے سلمیٰ

سلمیٰ اختر کی شاعری میں خواہ استعارہ حسن بنی ہو یا کسی نے اسے اختر کا جمال ذہنی یا شعری مفروضہ سمجھا ہو۔ واقفان راز کے مطابق وہ محض شاعرانہ علامت نہیں بلکہ وہ اختر کی پہلی اور حقیقی محبوبہ ہے جسے انھوں نے ٹوٹ کر چاہا اور تاعمر اسی کے نغمہ خواں رہے۔

بحیثیت مجموعی اختر شیرانی نے اپنی شاعری کی مختلف ہیئتوں میں نسائی حسن و جذبات کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ اس تصویر کشی میں انھوں نے نسوانی حرمت و عظمت کا احترام کرتے ہوئے کافی حد تک اپنے دامن شاعری کو فحش نگاری اور عریانیت سے بھی بچائے رکھا۔ نسائی حسن کے بیان میں وہ جنس محبوب اور اسم محبوب کا بھی بلا خوف اظہار کرتے ہیں۔ نسائی شاعری کے زمرے میں اختر شیرانی کو اپنے مخصوص انداز اور شعری تجربات کی بنا پر امتیازی مقام حاصل رہے گا۔

□□□

Dr. Rashid Miyan
Assistant Prof.
C/o. Qamar Ghalib
Mohalla Goal
Near Masjid Goal
Tonk- 304001 (Rajasthan)

اشفاق احمد آہنگر

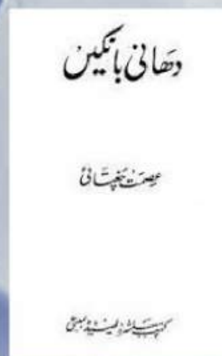

عصمت چغتائی
کی ڈرامائی کائنات

ترقی پسند تحریک نے جن قلم کاروں کے ذوق کو جلا بخشی ان میں ایک نام عصمت چغتائی کا بھی ہے۔اس تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں کی تحریروں میں جدت اور بے باکی کا عنصر صاف نمایاں ہے۔شروع میں گرچہ حجاب امتیاز علی سے متاثر تھیں لیکن آگے چل کر وہ بے باک اور ترقی پسند افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں کی شیدائی بن گئیں۔آپ لکھنؤ میں پروگریسیو رائیٹرز مومنٹ Progressive Writer's Movement سے بھی پیوستہ رہی۔اوائل عمری ہی سے نڈر، جرأت مند اور مزاج کی تیز تھیں۔انھوں نے دنیا کو اشتراکی اور انقلابی نظریے سے پرکھنے کی کوشش کی اور فرسودہ نظام زندگی، سماجی و مذہبی قدغنوں اور اخلاق سوز واقعات کو کاغذ کے سینے میں نہایت چابک دستی سے اتارنے کی سعی کی۔عصمت چغتائی ادب برائے زندگی کی قائل تھیں اور زندگی کی آخری سانس تک اسی فکر کی پرورش کی۔اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے:

”ایسا ادب جو انسان کی ترقی چاہے۔انسان کی بھلائی چاہے۔وہ ادب وہ ارٹ جو انسان کو پیچھے نہ دھکیلے۔انسان کو دنیا کی اچھی سمت پر چلائے۔وہ ادب جو انسان کو صحت، علم اور کلچر حاصل کرنے میں مدد دے اور جو ہر انسان کو برابر کا حق دینے پر یقین رکھتا ہو۔انسان کی زندگی کے عروج کا قائل ہو۔انسان کو گندگی سے نکال کر صاف و شفاف علم کی طرف پہنچادے۔مکمل طور پر انسان کی بھلائی چاہے۔اس کے سوچنے کے انداز پر ایسا اثر ڈالے کہ بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھے۔اندھیرے میں جانے کی بجائے اُجالے کی طرف آئے۔وہ ادب ترقی پسند ہے۔“

ان کے ادبی کارناموں میں 11 افسانوی مجموعوں کے علاوہ 11 ناولیں، 15 خودنوشت، 2 رپوتاژ، 14 انٹرویو، 15 فلمی کہانیاں اور کئی ڈرامے بھی ہیں۔ موپاساں Guy de Mupassant، انتون چیخوف Anton Chekhov اور دیگر ادیبوں کے مطالعے نے ان کی ذہنی پرداخت فکروفن کو قوت بخشی۔

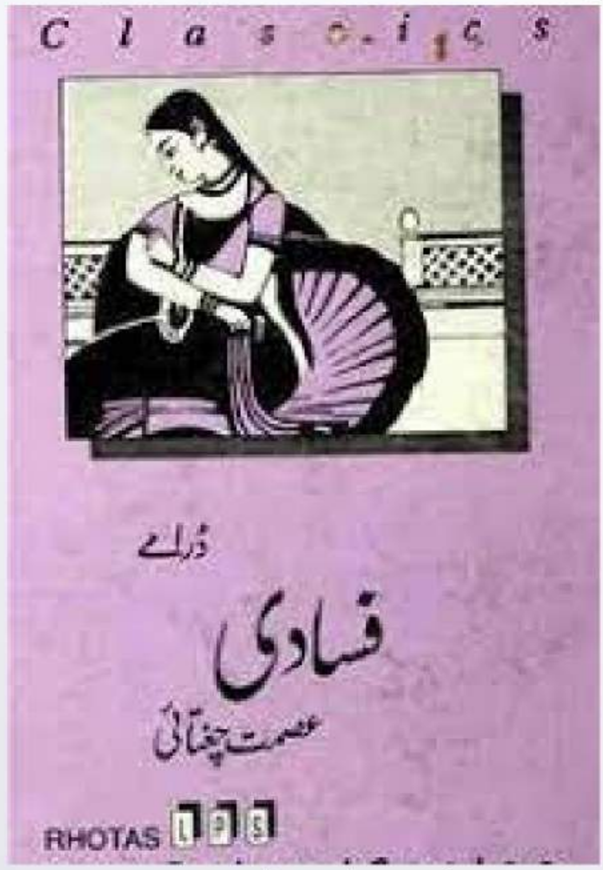

اردو ڈرامائی روایت بالخصوص ترقی پسند ڈراما نگاروں میں عصمت بلند مقام رکھتی ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں ان کے ڈراموں کا طرز بیان انوکھا اور دل کش ہے۔ خواتین کی نفسیاتی الجھنوں اور گھریلو مسائل پر انھوں نے کئی ڈرامے ترتیب دیے۔ آپ نے نسوانی کرداروں کے ذریعے عورتوں کی روزمرہ زندگی کو ایک خاص زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ سانپ اور انتخاب ڈرامے تو ایسے ہیں جن میں وہ ساری کیفیات دکھائی گئیں جو ایک کنواری لڑکی کو درپیش آتی ہے اور کمال یہ ہے کہ ان کے ڈراموں کے نسائی کردار حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کر کے اپنی حیثیت منواتے ہیں۔ میرے نزدیک خواتین فکشن نگاروں میں رشید جہاں کے بعد اگر کسی نے عورت ذات پر کھل کر لکھا، تو وہ عصمت چغتائی ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنے مضمون 'ترقی پسند ادب اور میں' میں لکھتی ہیں:

"جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تب میں اپنا اصلی دشمن اپنے بزرگوں کو سمجھتی تھی۔ ان کے بندھنوں سے آزاد ہونا میرا نصب العین تھا۔ میں نے جو بند شیں گھر کی چہار دیواری میں رہ کر جھیلی تھیں ان کو توڑنے کی کوشش کی، اپنی کہانی میں ایسی لڑکی پیش کی جو پرانی قدروں یعنی جھوٹی شرم وحیا کی قائل تھی۔ خاندانی نام و نمود کی خاطر اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار نہیں تھی۔"

راقم کے ہاتھوں میں ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'فسادی 1992' ہے جو روہتاس بکس احمد چیمبر 5۔ ٹیمپل روڈ، لاہور سے میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ 160 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں کل چھ ڈرامے شامل ہیں، جن کے نام یوں ہیں: 'فسادی'، 'پردے کے پیچھے'، 'سانپ'، 'انتخاب'، 'ڈھیٹ' اور 'بنے'۔ اس کے علاوہ انھوں نے مشہور ڈراما 'دھانی بانکپن' بھی لکھا ہے۔ اگرچہ عصمت ڈراما نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں ہوئیں لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے جتنے ڈرامے بھی لکھے ہیں وہ قابل مطالعہ ہیں۔ وہ اپنی ڈراما نگاری کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

"میں کسی کی رائے سے متاثر ہونے کی عادی نہیں۔ میں نے صرف ایک بار پطرس صاحب کی رائے پڑھی تھی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مجھے ڈرامہ لکھنے کا فن نہیں آتا۔ پھر میں نے یوں ہی ایک ڈرامہ لکھا تو مجھے اس پر ایوارڈ مل گیا۔ اور سب کو پسند آیا۔"

"دھانی بانکپن"، یہ ایک تاریخی ڈراما ہے، جو 1947 میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ اپٹا کی بمبئی شاخ نے اس ڈرامے کو 1947 کو اسٹیج کیا۔ اس ڈرامے میں عصمت نے برصغیر کے فسادات کا نقشہ کرب ناکی کے ساتھ کھینچا ہے۔ چونکہ یہ سارے فسادات ان کی نگاہوں کے سامنے تھے اس وجہ سے ڈرامے میں (بھاؤ) Emotions کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ 1947 کا دور ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ کن دور تھا۔ اس دور میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے۔ اگرچہ یہ فسادات ہندوستان میں کوئی نئی لہر نہیں تھی لیکن جس پیمانے پر ۱۹۴۷ء میں خون خرابے کا بازار گرم ہوا اسے دیکھ کر چشم فلک نے بھی آنسو بہائے ہوں گے۔ اس معرکہ آرائی نے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا کیونکہ یہ دو فرقوں یا گروہوں کی لڑائی نہ تھی بلکہ دو قومی نظریے Two Nation Theory کی جنگ تھی، جس نے برصغیر کے عوام کو خون کے آنسوں رُلا دیے۔ ڈرامے کا مطالعہ کرتے وقت پتا چلتا ہے کہ اس سال

ہندوستان کے گلی کوچوں، سڑکوں اور بازاروں، مندروں اور مسجدوں کو بے گناہوں کے خون سے لیپ دیا گیا تھا۔

مذکورہ ڈرامے میں عصمت چغتائی نے دو خاندانوں کی کہانی کو ایک ساتھ بیان کیا ہے جن میں ایک ہندو اور دوسرا مسلمان ہے۔ یہ دونوں خاندان برسوں سے ایک دوسرے کے گہرے دوست اور غم خوار رہے ہیں۔ ڈرامے میں کل دس کردار ہیں۔ (1) منہارن، (2) برج نرائن (3) روپا (4) سورج (5) لکشمی (6) حامد علی (7) عائشہ (8) خورشید (9) دو پڑوسن۔

ڈرامے کے پہلے منظر میں جب دونوں دوست ایک ساتھ دفتر جاتے ہوئے کچہری روڈ پر پہنچتے ہیں تو وہاں ہندو مسلمان آپس میں لڑتے ہیں۔ برج نرائن دونوں فریقین کے مابین صلح کی راہ نکال رہے تھے کہ ایک زور دار پتھر اس کے سر سے ٹکرا جاتا ہے اور وہیں دھڑام سے گر جاتا ہے۔ اس کا دوست مرزا حامد فوراً اس کو کندھا دینے والا تھا کہ پیچھے سے شر پسندوں نے چاقو سے بے دردی سے مار دیا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد جب ان کی لاشیں گھر پہنچائی گئی تو وہاں صف ماتم بچھ گئی۔ روپا اور عائشہ انھیں دیکھ کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہیں۔

ڈرامے کے دوسرے منظر میں حامد اور برج نرائن کے قتل کے دس سال بعد پھر سے شر پسندوں نے فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکا دیا۔ ایسے میں چہار سو خوف و ہراس کا ماحول پیدا ہونا یقینی تھا۔ ایک رات جب ان کے بیٹے (سورج اور خورشید) وقت پر گھر نہیں پہنچے تو ہلکان ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ بے خودی کی حالت میں بھی خوف کی شکار نظر آتی ہے:

''روپا: (خواب کی حالت میں) نہیں، نہیں، نہ مارو، میرے لال کو۔۔۔ بچاؤ بچاؤ۔۔۔ بھگوان کے لیے رہا کرو۔۔۔ (بری طرح کلیجہ مسوستی ہے) نہ مارو، چھوڑ دو (گڑگڑ گڑا کر) اِسے چھوڑ دو، یہ ہندو نہیں یہ مسلمان نہیں، یہ تو مجھ ابھاگن کا بیٹا ہے۔ میرا بیٹا۔ دیکھو۔۔۔ دیکھو۔۔۔ میری طرف دیکھو۔۔۔ یہ میرے کلیجے کا ٹکڑا ہے، اس نے کبھی کسی کو نہیں مارا۔۔۔ میں نے بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑا نہ بہاو اس کا لال لال خون، مٹی پر نہ پھینکو یہ ماں کا دودھ ہے۔ ماں، تمھاری بھی تو ماں ہے؟۔۔۔''

ڈرامے کے تیسرے اور آخری منظر میں عائشہ کی زندگی پر گزرنے والی ہیبت ناکی کو بیان کیا گیا ہے۔ زندگی سے لڑتے لڑتے نڈھال ہو جاتی ہے۔ فسادات کے خوف نے ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ رات کے وقت جب وہ سوئی ہوئی ہوتی ہے اس کی زبان سے یہ کلمات نکلتے ہیں:

عائشہ: (کے چہرے پر روشنی کا دائرہ پڑتا ہے۔ سوتے میں اس کے کان میں بھی وہی موت کی مہیب پکار گونجتی ہے۔۔۔) مار ڈالا۔۔۔ ۔۔۔ظالمو۔۔۔تم نے میرے خورشید کو مٹی میں ملا دیا۔۔۔تم نے اس کے سینہ میں چھرا گھنگول دیا۔ آہ اس کی آنتیں باہر نکل پڑیں۔۔۔''

'دھانی بانکیں' ایک المیہ ڈراما ہے جسے پڑھ کر آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔ ڈرامے کے ذریعے عصمت نے سماج کے وحشیانہ پن کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ گھٹا ہوا ہے، کردار اور مکالمے اپنی اپنی جگہ پر مربوط ہیں۔ زبان بڑی سادہ اور سلیس ہے۔ مکالمے چست ہیں۔ انداز بیان پر اثر ہے۔ خود کلامی کے بڑے بڑے مکالمے ملتے ہیں۔ بالخصوص صفحہ 60، 61، 62 پر اتنے مکالمے ہیں کہ قاری بوجھل محسوس کرتا ہے۔ جذبات نگاری اور واقعہ نگاری نے اس ڈرامے میں جان پیدا کی ہے۔ البتہ ڈرامے کے آخر پر تجسس کی کمی محسوس ہو رہی ہے، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مصنفہ نے ڈرامے کا اختتام اس جگہ پر کیا ہے کہ قاری کا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔

'سانپ' عصمت چغتائی کا لکھا ہوا یکبابی ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں کل پانچ کردار ہیں جن کے نام: سید، رفیعہ، غفار اور ظفر ہےz۔ اس ڈرامے میں انھوں نے بہرو پیوں کے مختلف روپ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ڈرامے میں جب سید اور رفیقہ کے باپ کا انتقال ہوتا ہے تو وہ صرف دکھاوے کے لیے کالے ماتمی لباس زیب تن کرتے ہیں۔ انہیں باپ کے مرنے پر کوئی افسوس نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی مستی میں مگن ہیں۔ کچھ دن بعد جب رفیعہ کا منگیتر غفار تعزیت پرسی کے لیے آجاتا ہے، تو وہ بھی سوگ منانے کے بجائے ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

ڈرامے کے دوسرے منظر میں رفیعہ جو ایک طوائف قسم کی لڑکی ہے، اپنی میٹھی میٹھی باتوں اور نازک اداؤں سے مردوں کو پھسلا کر انھیں اپنا اسیر بنا لیتی ہے کیونکہ اس سے اس کو جنسی تسکین Sexual satisfaction ملتی ہے۔ وہ پرائے مردوں کے ساتھ تعلقات جوڑ لینے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ اس کے بھائی سید کو یہ قطعاً برداشت نہیں کہ اس کی بہن غیر محرم مردوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرے:

''سید: تمھیں شرم نہیں آتی مگر میں تو ذلیل ہوتا ہوں۔ اچھا تم اسے عبدالرحمٰن کو کیوں خط لکھتی ہو؟

رفیقہ: (سادگی سے) چند ضروری باتیں پوچھنا تھیں اسی لیے۔

سید: وہ ضروری باتیں میں جانتا ہوں کیا ہیں؟

رفیعہ: جب جانتے ہی ہو تو میرا دماغ کیوں چاٹ رہے ہو؟"
رفیعہ: کیا معلوم۔۔۔قسمت کی کس کو کیا خبر؟ فرض کرو۔ غفار مجھ سے شادی نہ کرے اور جیسے کہ تم کہتے ہو ظفر میرے اوپر تھوکتے بھی نہیں۔ تو پھر یہ۔۔۔ٹھیک رہے گا۔۔۔ روپیہ بہت ہے۔ سید پھر دونوں۔" 46

ان دونوں کی گفتگو کے دوران جب سید کی چاہنے والی خالدہ آجاتی ہے تو رفیعہ موقع کا فائدہ اٹھا کر دونوں پر طنز کرنا شروع کر دیتی ہے۔ حالانکہ سید ایک نیک قسم کا آدمی ہے۔ وہ اس سے دور رہنے ہی میں عافیت سمجھتا ہے مگر دوسری طرف رفیعہ پوری کوشش کرتی ہے کہ وہ کسی طرح خالدہ کے جال میں پھنس جائے تا کہ اسے پھر پرائے مردوں سے ملنے میں کسی طرح کی رکاوٹ محسوس نہ ہو۔ اس کی یہ ساری کوشش اس وقت رائیگاں ہوتی ہے جب سید، خالدہ سے کہتا ہے:

سید: یہ مکاری نہیں تو پھر کیا ہے کہ خود۔۔۔تو میرے سر پر چڑھ کر آتی ہو اور اپنی سہیلیوں سے کہتی پھرتی ہو سید میری جاتیاں چاٹتا ہے، منہ۔۔۔"

ڈرامے کے آخر میں رفیعہ کا دل غفار سے بھر جاتا ہے اور وہ اسے چھوڑ کر ظفر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ وہ اس سے قربت حاصل کرنے کے لیے کئی طرح کے گر استعمال کرتی ہے۔ اس کے لیے وہ اسے اپنا استاد بنانے کے لیے طرح طرح کی منتیں کر رہی ہے مگر ظفر پھر بھی انکاری ہے۔ رفیعہ کو جب محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس طرح ماننے والا نہیں ہے تو وہ اس کی داڑھی کو پکڑ کر التجا کرنے لگتی ہے۔ ظفر جھٹک کر اس کا ہاتھ نیچے کر دیتا ہے اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے کہتا ہے:

"ظفر: میرے باپ نے فلسفی نہیں پڑھی تو تمھیں کیا خاک پڑھاؤں گا۔
رفیعہ: تو پھر اکنامک پڑھا دینا۔
ظفر: کیا بک رہی ہو۔ یہ بنیوں والے مضامین میں کیا جانو۔ میں سائنس اسٹوڈنٹ ہوں۔"

رفیعہ، ظفر کی محبت میں اتنی سرشار ہے کہ وہ بنا کسی خوف کے جذبات میں آ کر ظفر سے کہتی ہے کہ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں اور تم ہی سے شادی کروں گی۔ میں غفار سے شادی نہیں کروں گی۔ یہ دیکھ کر غفار کے دل کو ایک دھچکہ سا محسوس ہوتا ہے اور وہ خاموشی سے دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس کی زبان سے بے ساختہ سانپ! کا لفظ نکل جاتا ہے اور بغیر رفیعہ کی طرف دیکھے ہوئے ایک دم دروازے سے نکل جاتا ہے۔ اس طرح یہ ڈراما اختتام کو پہنچتا ہے۔

اس ڈرامے کا پلاٹ چست ہے۔ واقعات ایک کے بعد ایک بتدریج آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کردار نگاری کے اچھے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ڈرامے میں رفیعہ کے اندر بے وفائی اور دغابازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس ڈرامے میں مرد کے بجائے عورت عشق کا اظہار کرتی ہے۔ ڈرامے کی مرکزی کردار رفیعہ ہے۔ اس کے اندر بے وفائی اور دغابازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اسے کسی کا لحاظ نہیں ہے۔ ایک لالچی اور فریبی ہے۔ وہ کسی کی بالادستی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنے بھائی سید کے رعب و دبدبے سے بھی نہیں ڈرتی ہے۔ ڈرامے میں شروع سے آخر تک دونوں بھائی بہن کے درمیان دشنام طرازی ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ڈراما اخلاقی اقدار کی پامالی کی نشاندہی کرتا ہے۔ مصنفہ نے سماجی قدروں کے زوال کے اوپر بڑی بیباکی سے اپنا نظریہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

اگلا ڈراما انتخاب ہے جس میں موصوفہ نے ایک مکار دوست کی اندرونی نفسیات اور کیفیات کو بیان کیا ہے۔ جو دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کی بہن تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ڈرامے میں کل پانچ کردار ہیں۔ جن کے نام اس طرح ہیں۔ خالہ بی، اس کی بھانجی شمیم، شمیم کا بھائی واجد اور واجد کا دوست عالم۔

ڈراما کا آغاز خالہ بی اور شمیم کی گفتگو سے ہوتا ہے۔ پردہ اٹھنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ خالہ بی، شمیم کی عفت و عصمت پر پہرا دے رہی ہے۔ مگر عالم جو کہ ایک شاطر دماغ اور عاشق مزاج لڑکا ہے۔ وہ شمیم کو آہستہ آہستہ منوا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ڈرامے میں اس بات کی خبر جب واجد کو ہوتی ہے تو اس پر قیامت سی ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس وقت اس کی بہن عالم کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہوتی ہے اور خوشی خوشی اس کے ساتھ جانے کے لیے راضی ہے۔ ڈرامے کے آخر میں جب دونوں ایک ساتھ سیر سپاٹے کے لیے باہر چلے جاتے ہیں تو انھیں کسی شرمندگی یا خجالت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ واجد کو طنزاً اور مذاق اڑاتے ہوئے نکلتے ہیں۔

"عالم: (جس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے) مگر۔۔۔یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم نے کب دیکھا۔۔
واجد: ہاں۔۔۔ہاں ہم نے دیکھا۔۔۔اور وہ خوشخبری بھی مل گئی ہمیں اور اسی وجہ سے ہم لوگ اس

وقت اس قدر مسرور نظر آرہے ہیں (طعن سے) اور ہاں آپ کو مبارک باد (لے کے پہلے تو۔۔۔

واجد: بے شک (کار کی آواز سن کر) اٹھو شمو!

عالم: مگر۔

(واجد اٹیچی اٹھا کر شمیم کی کمر میں پیار سے ہاتھ ڈال کر اسے لے جاتا ہے) عالم غضب پریشانی کے عالم میں ڈھیلا ڈھالا کھڑا رہ جاتا ہے گویا کسی نے اسے کچل دیا ہو۔ پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ گویا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ خواب ہے۔''

اس ڈرامے کو لکھے ہوئے اگرچہ ۷۰ سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا مگر اس طرح کے افسوس ناک واقعات آج بھی ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس ڈرامے کی کہانی شمیم کے گرد گھومتی ہے جو ایک تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی ہے اور عالم کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد اپنے خاندان کی عزت کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ اس ڈرامے میں عصمت نے سماج کو بدلتے ہوئے رویوں سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں لڑکیاں اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔ اس ڈرامے کی فضا رومانوی Romantic ضرور ہے لیکن اس کے پس پردہ عصمت چغتائی نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ عورت گوشت پوشت کی بنی ہوئی مخلوق ہے۔ اس کے دل میں بھی ارمان ہے جن کی وہ تکمیل چاہتی ہے۔ جس طرح مرد کی خواہشات ہوتی ہے اسی طرح عورت کی بھی ہوتی ہیں۔ اس ڈرامے کی عمر اگرچہ 27 سال ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو آج بھی ہمارے سماج میں ایک لڑکی کو اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا حق نہیں۔ وہ اپنی پسند کا پیشہ اختیار نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ اپنی مرضی سے اپنا جیون ساتھی چن سکتی ہے۔

غرض اعتراف کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جھوٹی وضعداری اور فرسودہ قصہ کہانیوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک سچی اور حقیقت پسند مصنفہ ہونے کی حیثیت سے وہ کام کیا جو صرف ایک بے خوف فن کار عورت ہی کر سکتی ہے۔ اس حوالے سے فضیل جعفری اپنے مضمون 'عصمت چغتائی کا فن' میں لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک عصمت کی افسانوی دنیا کا Spectrum تین عناصر سے ترتیب پاتا ہے۔ (1) حقائق کو قلم بند کرنا (2) حقیقی دنیا کی عمومی شکلوں یا ان سے متعلق نظریات کو افسانوی شکل میں پیش کرنا (3) ایسے واقعات کی مدد سے افسانہ ترتیب دینا جو حقیقت نہ ہوں لیکن حقیقت سے مشابہت رکھتے ہوں۔۔۔ انھوں نے اپنے ماحول کو غیر مبہم اور بے جھجک انداز میں پیش کیا ہے، ان کے نزدیک گھریلو، اخلاقی سچائیاں دراصل، جمالیاتی سچائیوں کا نعم البدل ہوتی ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ ہے زندگی کی دلچسپ ترین سچویشنز گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی جنم لیتی ہیں۔''

جہاں تک عصمت کے ڈراموں کی تکنیک کا تعلق ہے تو ان کے ڈراموں کی کہانی ایک فطری تسلسل اور آہستہ روی کے ساتھ آگے چلتی ہے۔ ڈراموں کا عنوان نقطہ نظر Point of View کے ساتھ اچھی طرح میل کھاتا ہے۔ البتہ وحدت تاثر Unity of Expression کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہمیں ان کے ڈراموں کے کردار زیادہ دیر تک متاثر نہیں کر پاتے۔ ڈرامے کے مکالموں کی برجستگی، چستی، ایجاز و اختصار اور روزمرہ کی گفتگو اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کا ڈکشن لاجواب تھا۔ وہ اپنے کرداروں کی زبان سے الفاظ آبشار کی طرح کہلواتی۔ تہذیب یافتہ کرداروں کے منہ میں سلجھی اور نکھری ہوئی زبان ڈال دیتی جبکہ ان پڑھ اور گنوار کرداروں سے طعنے، تشنے اور انواع واقسام کی گالیاں دلواتی تھیں۔ انھوں نے زیادہ تر نسوانی کرداروں کی تراش خراش پر کو ترجیح دی۔ انھیں وہ باتیں سوچنے اور بیان کرنے کی ترغیب دی جنھیں وہ اپنی زبان پر لانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی تھیں۔

حوالے:

1۔ محمد کلیم محی الدین، عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری، اردو دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ستمبر 2012

2۔ ڈاکٹر جمیل اختر، عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر، انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن، اگست 2001، 3۔ ایضاً

4۔ عصمت چغتائی، دھانی بانکپن، کتب پبلشرز لمیٹیڈ بمبئی، جون 1947، ص: 3-14

5۔ ایضاً، ص: 75، 6۔ ایضاً، ص: 81، 7۔ ایضاً، ص: 86

8۔ ایضاً، ص 125، 9۔ ایضاً، ص: 62

10۔ عصمت چغتائی، فسادی، روہتاس بک لاہور 1992، ص: 74

□□□

Ishfaq Ahmad Ahanger
Research Scholar
Central University of Kashmir
Ganderbal-91201 Kashmir
ishfaqahanger@gmail.com

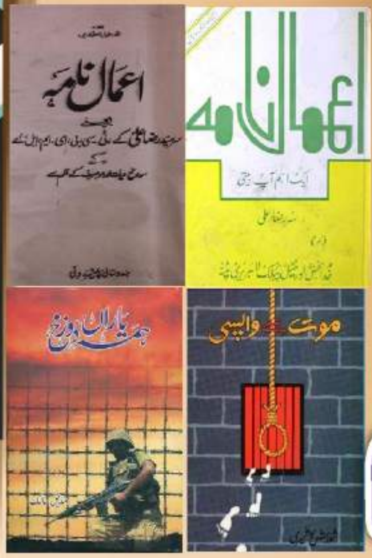

صدف نفیس

اردو کی زندانی خودنوشت کا تنقیدی محاکمہ

اردو ادب میں خودنوشت غیر افسانوی نثر کا ایک اہم حصہ ہے۔ خودنوشت سوانح حیات لکھنے کا فن دراصل اپنی کہانی خود اپنی زبانی لکھنے کا فن ہے۔ ہر انسان کے اندر خود کو نمایاں کرنے کی خواہش کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہے اس فن کے پیچھے اسی خواہش کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ خودنوشت جسے ہم آپ بیتی بھی کہتے ہیں، لکھنے کے لیے صفحات کی تعداد طے نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایک پرزے سے لے کر ہزاروں صفحات پر مشتمل ہوسکتی ہے۔ آپ بیتی کو منثور ہونا لازمی امر تو نہیں لیکن نثر میں بیان کی زیادہ گنجائش ہونے کے سبب منثور خودنوشت ہی مروج رہی ہیں جبکہ واجد علی شاہ اور منیر شکوہ آبادی نے منظوم آپ بیتیاں بھی لکھیں ہیں۔ اسی طرح اس کے لیے کسی خاص ڈھانچے کی بھی ضرورت نہیں لیکن بعض ناقدین نے اس کے لیے کچھ اصولوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ صداقت، شخصیت اور فن، یہ تینوں امر ایک کامیاب خودنوشت کے لیے لازمی جزو ہیں۔ آپ بیتی کو صداقت پر مبنی ہونا چاہیے۔ تخیل کی بنیاد پر تصوروں کی دنیا میں کسی خود نوشت کو تحریر نہیں کیا جاسکتا ہے اگر خودنوشت میں حقیقت بیانی نہ ہو تو اس کو لکھنے کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ خودنوشت میں حقیقی زندگی اور اس کے لوازمات کا ذکر ہوتا ہے یہ اتنی ہی رنگین اور متنوع ہوتی ہے جیسے کی اصل زندگی۔ اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی خامیوں کے بیان میں غیر جانبدارانہ رویہ رکھنا ایک مشکل ترین عمل ہے۔ سید رضا علی کا یہ جملہ اس اعتبار سے بہت معنی خیز معلوم ہوتا ہے:

> ”میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہیے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آکر باآواز بلند پڑھ لیں تو پڑھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔“ (صفحہ 8۔ دیباچہ۔ اعمال نامہ از سید رضا علی)

خودنوشت میں سوانح نگار خود اپنی ذات اور شخصیت کو محور بنا کر اس کے اردگرد تانا بانا بنتا ہے۔ یہ کسی کی زندگی کا بڑا ہی دلچسپ پہلو سامنے رکھتی ہے جس میں سارے رنگ واحساس اسی طرح بے پردہ ہو کر سامنے آتے ہیں جیسے کی خود مصنف کی اصل زندگی میں رونما ہوئے ہوں۔ آپ بیتی میں جگ بیتی کا عنصر کس قدر ہو اس کا فیصلہ مکمل طور پر مصنف کی سرشت پر منحصر کرتا ہے۔ خودنوشت میں جگ بیتی اتنی بھی نہ ہو کہ آپ بیتی ضمنی موضوع بن کر رہ جائے یا آپ بیتی اس حد تک نہ ہو کہ

> ’خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے‘

خودنوشت صرف اپنی یادوں کو ضابطہ تحریر میں لانے کا فن نہیں ہے بلکہ یہ ایک ادبی کارنامہ ہے۔ جس طرح افسانوی نثر میں تخیل کی بنیاد پر کسی کہانی کو حقیقت بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس کے متضاد خودنوشت میں

حقیقت کو خوب صورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس میں بیانیہ نہ اتنا طویل ہونا چاہیے کہ پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس کرنے لگے اور نہ اتنا مختصر کہ مصنف کی شخصیت سے قاری تشنہ رہ جائے۔اکثر اس بات پر بار بار بحث کی گئی ہے کہ خودنوشت کے لیے زیادہ اہم چیز کیا ہے؟ سوانح نگار کی ذات یا اس کی تحریر کردہ خودنوشت۔ اردو میں ان لوگوں کی خودنوشت نے زیادہ پزیرائی حاصل کی ہے جن کو ادبی طور پر کچھ زیادہ مقام حاصل نہیں تھا۔ ادبی طور پر اعلیٰ مقام رکھنے والوں میں بہت کم ہی خود نوشت نگار اصل موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جیسے ''یادوں کی بارات'' جوش ملیح آبادی کی وجہ سے کافی مقبول ہوئی لیکن بطور خودنوشت اس نے اعلیٰ مقام حاصل نہیں کیا۔خودنوشت لکھنے کے لیے مصنف کی زندگی کا کوئی خاص دور طے ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ بچپن سے جوانی یا جوانی سے بڑھاپے تک کے بیان سے مزین ہوسکتی ہے یا زندگی کے کسی خاص حصہ پر مرکوز ہو کر بھی لکھی جاسکتی ہے۔اس کے لیے اصل زندگی میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات کا تسلسل کے ساتھ بیان ہونا ضروری ہے۔

اردو میں ایسے مصنفین کی تعداد کافی ہے جنھوں نے اپنے باغی تیور اور مجاہدانہ رویہ کی بنا پر قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔اردو ادب میں احتجاجی رویہ کی بنیاد فرخ سیر کے دور میں جعفر زٹلی کے ہاتھوں پڑ چکی تھی وقت کے ساتھ انگریزوں کے خلاف یہ رویہ زیادہ زور پکڑتا گیا۔سرفروشانِ وطن میں ایسے بہت سے ادیب و قلمکار شامل ہیں جنھوں نے مادرِ وطن کے لیے جیل جانے سے بھی گریز نہیں کیا۔انھوں نے قید و بند کے دوران اپنے قلم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر اس بات کا بین ثبوت پیش کیا ہے۔

زبان کو بند کر و یا مجھے اسیر کرو
میرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

اردو ادب کی زندانی نگارشات کا بھی ذکر کریں تو ان میں خطوط، تراجم، غزلیں، نظمیں ناول خودنوشت سوانح حیات وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ ان سبھی فن پاروں میں کسی نہ کسی شکل میں قید خانہ اور اس کے لوازمات، احتجاجی و مزاحمتی رویہ اور قید و بند سے پیدا ہونے والے احساسات اور نفسیاتی مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ان مسائل اور احساسات کو خودنوشت میں جتنے مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے یہ دوسرے فن پاروں میں تقریباً نا پید ہے۔اردو ادب میں ایسی بہت سی خودنوشتیں ہیں جو مصنف کی صرف قید و بند کی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔ عام زندگی میں کسی مصنف کو جاننے کے لیے ہم اس سے متعلق لوگوں سے بھی اس کی نجی زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن قید میں ان کی زندگی کے حالات و اکوائف کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے ایسے میں خود اس کے ذریعہ بیان کردہ باتوں کو حرف آخر قرار دیا جاسکتا ہے۔قید انسان کو زندگی کی عام مصروفیات سے نکال کر ایک لامتناہی فراغت سے روشناس کراتی ہے۔آزاد زندگی میں جہاں آس پاس کی بہت سی چیزوں پر ہم توجہ نہیں دے پاتے وہیں قید میں یہ سب چیزیں بڑی آسانی سے ہماری توجہ خود کی طرف مبذول کرا لیتی ہیں۔قید خانہ انسان کو جسمانی طور پر محبوس کر کے سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کے لیے ایک بڑی دنیا پیش کرتا ہے۔اس دنیا میں جہاں جسمانی قید انسان کے لیے پریشانی کا سبب بنتی ہے وہیں دوسری طرف ذہنی آزادی اور فراغت اس کے لیے ایک معجزہ ثابت ہوتی ہے لیکن قید کی لمبی مدت کا اپنا الگ اثر ہوتا ہے جو جزباتی شکست و ریخت اور اکتاہٹ و یکسانیت کی شکل میں آشکار ہوتا ہے۔زندانی خودنوشت کے موضوعات میں تنوع ہے ان میں جیل خانہ اور اس کے لوازمات، موسم، چرند پرند گزشتہ یادیں، صحت، خطوط، ملاقاتی ان سبھی چیزوں کے بارے میں تفصیلی جانکاری ملتی ہے۔زندانی خودنوشتوں کے اختصاصی پہلو کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو بظاہر یہاں بھی اپنا ہی بیان ملتا ہے لیکن ان خودنوشتوں میں مصنف کی شخصیت کا پرتو اور حقیقت، عام زندگی میں لکھی گئی خودنوشتوں سے زیادہ بہتر طور پر دکھائی دیتی ہے اور سوانح نگار کی اپنی ذہنیت، نفسیات اور موجودہ چیزوں اور واقعات پر اس کی آرا پہلے سے زیادہ روشن نظر آتی ہے۔ بقول سالک صدیقی:

''اسیری کے دو سالوں میں انسانی کردار کے سارے پہلو کھل کر سامنے آگئے۔ کیونکہ قید سب حجاب مٹا دیتی ہے اور ہر شخص ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے آجاتا ہے۔گرد و پیش سے معرا اس کتاب کا ایک ایک باب بول اٹھتا ہے۔ایک ایک لفظ حدیث دل بیان کرنے لگتا ہے۔صرف سکوت لالہ و گل پر کان دھرنے کی ضرورت ہے۔''

(197 صفحہ: ہم یارانِ دوزخ: سالک صدیقی)

زندانی خودنوشت کے حوالے سے ایک اہم بات کا ذکر کرتی چلوں کہ یہ بیشتر بیانیہ یا صحافتی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ طنزیہ انداز اور احتجاجی لب و لہجہ ان خودنوشتوں کی خاص خصوصیات ہیں۔غم و غصہ اور موجودہ حالات سے تنفر، اور باغی انداز ایسے عناصر ہیں جو تقریباً سبھی زندانی خودنو۔شتوں میں پائے جاتے ہیں۔ کچھ آپ بیتیاں دن و تاریخ میں تقسیم کر کے روزنامچہ کی شکل میں لکھی گئی ہیں، تو کچھ موضوعاتی انداز میں منقسم ہیں اور کچھ کی ابواب بندی اشعار کے عنوان سے کی گئی

ہے۔ بیشتر زندانی خودنوشت گرفتاری سے رہائی تک کی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں لیکن بین السطور میں ان کی پوری زندگی اس میں مترشح ہوتی ہے۔ ذیل میں کچھ خودنوشتوں کا اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو قید و بند کے دوران کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔

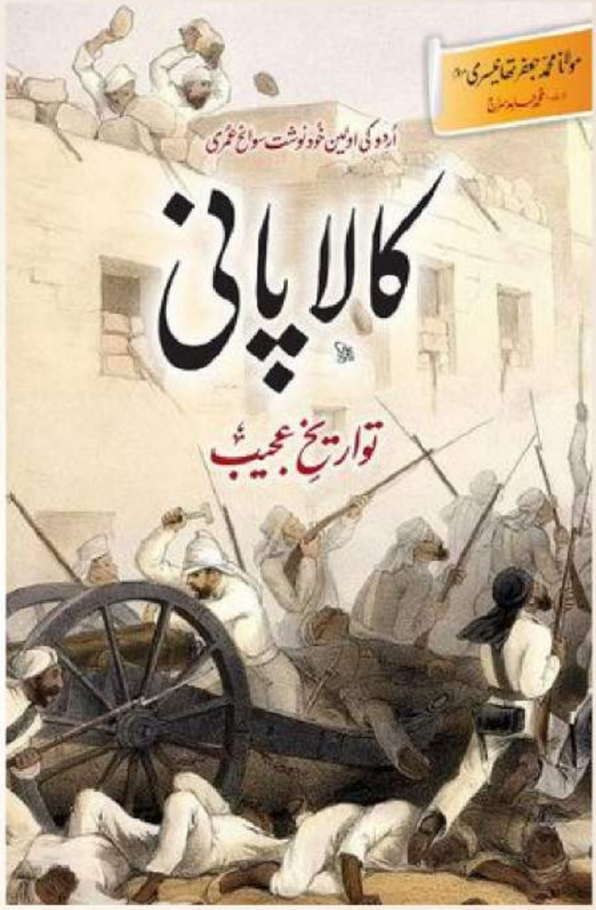

اس فہرست میں سب سے پہلے جعفر تھانیسری کا ذکر آتا ہے۔ جعفر تھانیسری کو باغیانہ رویہ کی وجہ سے انگریزوں نے سزائے موت سنائی لیکن بعد میں اس سزا کو کالے پانی کی سزا میں تبدیل کر دیا۔ اس سزا کے تحت انھوں نے تقریباً 18 سال انڈومان ونکوبار میں گزارے اس دوران انھوں نے تین کتابیں لکھیں جن میں ان کی سوانح حیات 'تواریخ عجیب' بھی ہے۔ اولین زندانی خودنوشت ہونے کے سبب اس میں کئی فنی خامیاں نظر آتی ہیں۔ اس کا اصل موضوع خود اپنی ذات کم بلکہ پورٹ بلیر انڈمان نکوبار کے جغرافیائی، سیاسی وسماجی حالات ہیں۔ کالے پانی سے وابستہ اردو ادب میں جتنی بھی جانکاری دستیاب ہے یہ کتاب ان سب کا اصل ماخذ ہے۔ اس کتاب میں انگریزوں کے جبر واستبداد اور کالے پانی کی سزا یافتہ لوگوں کی تفصیلی داستان ملتی ہے۔ جعفر تھانیسری جب گرفتار ہوئے تو آل اولاد والے تھے انڈومان میں آ کر انھوں نے دوسری شادی کی جس سے ان کو دس بچے پیدا ہوئے، یہاں سے رہائی کی بعد یہ بیوی بچے بھی ان کے ساتھ واپس ہندوستان آئے۔ جعفر اور ان کے ساتھیوں کو پانی کے جہاز سے انڈمان نکوبار بھیجا گیا تھا۔ اس بے آب گیاہ ویران سرزمین کو دیکھ کے پہلا تاثر کچھ ایسا تھا:

> ''دور سے سمندر کے کنارے کالے پتھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھینسوں کے جھنڈ کے جھنڈ پانی میں پھر رہے ہوں، چونکہ کالا پانی اور سنگلاخ چٹانیں بالکل ساحل پر واقع ہیں اس لیے انکا عکس بھی بہت مہیب اور ڈراونہ ہوتا ہے۔ رہی سہی کسر کالی مٹی گندلی ریت اور سناٹا پوری کر دیتا ہے۔ یہ سارا منظر کالا پانی کا نام دینے کا موجب بنتا ہے۔''

(ص146: تواریخ عجیب کالا پانی: جعفر تھانیسری)

اس کے بعد زندانی خودنوشت کے حوالے سے آغا شورش کاشمیری کا نام آتا ہے۔ ان کی پیدائش 14 اگست 1917 کو لاہور میں ہوئی۔ گھریلو ماحول کی وجہ سے وہ کھیل کود کی عمر میں ہی آزادی کی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ صرف 13 سال کی عمر میں اپنے ایک ہندو دوست اوم پرکاش کی مدد سے 1930 میں ''بال بھارت سبھا'' کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اپنے ہم عمر دوستوں کو آزادی کی تحریک میں شامل کرنا تھا۔ 17 سال کی عمر میں ان کی تقریر، پہلی گرفتاری اور دو سال قید کی سزا کی موجب بنی۔ ملک اور قوم کی خاطر نوعمری میں ہی انھیں مختلف بار جیل کی سزا کاٹنی پڑی۔ یہ اپنی عمر کے ستائیسویں سال تک پہنچتے پہنچتے 9 سال کا لمبا عرصہ قید و بند کی نظر کر چکے تھے۔ انھوں نے اپنی قید و بند کی روداد کو مختلف خودنوشتوں میں بیان کیا ہے۔ آزادی سے قبل کی دس سالہ قید و بند کی زندگی کا ذکر ان کی خودنوشت 'پسِ دیوارِ زنداں' میں بڑے خوں چکاں انداز میں ملتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر 1947 تک کی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ بظاہر تو یہ آپ بیتی ہے لیکن شورش نے زبان و بیان کا وہ جادو جگایا ہے کہ اس دور کی سبھی تحریکی رہنماؤں، خصوصاً پنجاب کی سیاسی وسماجی صورتحال اور اس وقت پنجابی مسلمانوں پر اس کے اثرات کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بیرسٹر جیل سے عام جیل تک کی ان کی زندانی زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات واحساسات وقید خانے کے انتظامات اور ان کے قیدی ساتھیوں کا بھی مفصل بیان ملتا ہے اور ان امور کا بھی اشارہ ملتا ہے جو بعد میں ملک کی تقسیم کی وجہ بنے۔ یہ کتاب ان کے جواں سال بھائی کی موت کے المیہ پر ختم ہوتی ہے۔

"تمغہ خدمت" ان کی تیسری زندانی خودنوشت سوانح حیات ہے۔قید وبند کی زندگی سے متعلق یہ خودنوشت روزنامچہ کی شکل میں لکھی گئی ہے۔1977 میں "بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل" کے نام سے ان کی ایک اور آپ بیتی منظر عام پر آئی جس میں آزادی سے قبل کی زندگی اور قید وبند سے متعلق گفتگو بھی کی گئی ہے۔یہ ایک ایسے بہادر اور جاں باز انسان کی خودنوشت ہے جس نے زندگی کے کسی بھی موڑ پر جبر واستبداد سے معانقہ نہیں کیا۔

"مکمل آزادی کا نعرہ" دینے والے حسرت موہانی نے بھی اپنی زندگی کے بہت سے دن قید میں گزارے ہیں۔'مشاہدات زنداں' ان کی زندانی خودنوشت ہے۔حسرت موہانی کے سیاسی اور باغیانہ رویہ کا علم پہلے ہی انگریزی حکومت کو ہو چکا تھا ایسے میں موقعہ کی تلاش میں انھیں حسرت کے رسالہ 'اردوئے معلیٰ' کا بہانہ ہاتھ آ گیا اور ان کے مضمون کو قابلِ اعتراض بتا کر انھیں گرفتار کر لیا گیا اور دو سال قید با مشقت کی سزا تجویز کر کے الہ آباد نینی جیل بھیج دیا گیا۔اس کتاب میں انھوں نے جیل میں کی جانے والی بے جا زیادتیوں کا ذکر کیا ہے، یہاں ان سے روزانہ ایک من گیہوں پسوایا جاتا تھا جس کا ذکر خود حسرت کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

> "جیل کی سخت ترین مشقت چکی سے پہلے روز سے سابقہ پڑا اور راقم نے بمصداق برسرِ اولادِ آدم ہرچہ آید بہ گزرد اس جبری قدمت کو بسرِ چشم قبول کیا۔۔۔قید کی تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پینے سے سروکار رہا۔حالانکہ تمام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی تھی۔"

(ص71،حسرت موہانی قید فرہنگ میں:عتیق صدیقی)

مشاہدات زنداں میں حسرت نے قید وبند کی زندگی سے متعلق بڑی دلچسپ اور معلوماتی باتوں کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے جیل میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان تفریقی انداز کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور جیل خانہ کے اہل کاروں کی زیادتیوں اور مجرموں کو سدھارنے کے نام پر کیے جانے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور آخر میں جیل خانہ میں سدھار کے چند نکات بیان کیے ہیں۔حسرت موہانی کو قید میں پڑھنے لکھنے کی سخت ممانعت تھی اس دوران اپنے کلام کو قید خانہ سے باہر بھیجنے کی تدبیر کو بھی بے نقاب کیا ہے۔'مشاہدات زنداں' کو صحافتی زبان میں تحریر کیا گیا ہے جسے خود حسرت نے اردوئے معلیٰ میں 1909 میں قسط وار شائع کیا۔

غلام سرور کا شمار بہار کی مایہ ناز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔وہ بہار کے وزیر تعلیم اور قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر اور دو مرتبہ وزیر زراعت رہ چکے ہیں۔وہ متعدد تحریکوں اور سیکڑوں احتجاجی مظاہروں کے قائد اور ایک بیباک صحافی تھے، اسی وجہ سے ان کو باغی دانشور کا لقب دیا گیا۔حق وصداقت کی پاسداری اور ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت کے سبب انھیں مختلف بار قید وبند سے واسطہ پڑا۔1964 سے 1972 کے درمیانی دور میں انھیں تقریباً چھ بار گرفتار کیا گیا، اس کے باوجود اہل حکومت انہیں حق گوئی و بیباکی سے باز نہ رکھ سکی۔قید خانہ کے اندر رہ کر بھی یہ سماج و معاشرے کی فلاہ و بہبود اور اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔زندانی ادب میں ان کی دو خودنوشت 'گوشے میں قفس کے'، 'جہاں ہم ہیں' اپنے دلچسپ اسلوب کی وجہ سے کافی مقبول رہیں۔'گوشے میں قفس کے' میں انھوں نے اپنی پہلی گرفتاری (14 مئی 1964 سے 23 اگست 1964) کے احوال وکوائف بیان کیے ہیں اور قید خانہ کی زندگی اور مقدمے سے متعلق گفتگو کی ہے۔اس کے علاوہ ان کی نجی زندگی، تعلقات، مذہبی عقائد اور اس دور میں بہار کی مختلف تحریکوں سے وابستہ قیدیوں اور مسلمانوں کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔آزادی کے بعد جیلوں کے حال ونظام اور ضابطہ سے متعلق اس کتاب میں پہلی بار تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اپنی اس خودنوشت میں انھوں نے اپنے قیدی ساتھیوں کا بڑے انوکھے انداز میں خاکہ کھینچا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔اشعار کا برجستہ استعمال ان کے اعلا ادبی ذوق کی گواہی دیتا ہے۔اپنی دوسری خودنوشت 'جہاں ہم ہیں' کو انھونے اپنی دوسری گرفتاری 1665 کے درمیان قید و بند کی حالت میں لکھا۔اس خونوشت میں ذاتی حالات کے علاوہ انھوں نے جیل خانے کے نظم ونسق اور موجودہ خامیوں کو طشت از بام کیا ہے۔دلچسپ عنوانات کے تحت اس خودنوشت میں قید خانے میں عام قیدیوں کے حالات ان کی نفسیات اور قید خانے کے اندر پھیلے اخلاقی وسماجی و جرائم کا مفصل بیان ملتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے معماروں میں حمید اختر کا نام قابل ذکر ہے۔حمید اختر نے سجاد ظہیر کی دست راست کی حیثیت سے کافی وقت تک کام کیا۔حمید اختر کو 9 مئی 1951 کو گرفتار کیا گیا۔اپنی اس ایک سالہ قید کی روداد کو انھوں نے اپنی خودنوشت 'کال کوٹھری' کے نام سے لکھا۔یہ کتاب ان کے قید وبند کے تجربات واحساسات کو بڑے حساس انداز میں بیان کرتی ہے۔یہ حمید اختر کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنی آپ بیتی کو اتنے وسیع پیرائے میں بیان کیا ہے کہ یہ ان کی نجی زندگی کے ساتھ ان کے کمیونسٹ دوستوں کی زندگی، قید خانے کے مختلف مجرموں کی زندگی، جیل

خانہ سے وابستہ ادنیٰ سے اعلیٰ ملازمین کی زندگی کا احاطہ کرنے کے باوجود کہیں بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر میں منظر نگاری کا وہ جادو جگایا ہے کہ ہر منظر قاری کو خود اپنی آنکھوں دیکھا حال معلوم ہوتا ہے۔ جیل خانہ کی انتظامیہ، قوانین اور اس کی خوبیوں اور خامیوں سے متعلق اس کتاب میں ایسے رموز بیان کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے آگے چل کر جیل انتظامیہ کے تدریسی نصاب میں اس کتب کو کچھ وقت کے لیے شامل کیا گیا۔ قیدی کی نفسیات، قید تنہائی کا اس کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات، سماج میں سزا و جزا کے طریقہ کار، عدلیہ کے طریقہ عمل، اور سزائے موت کے قیدیوں کی زندگی کے بارے میں جس طرح گفتگو کی گئی ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ خودنوشت دلکش صحافتی زبان، ظرافتی انداز، اور انوکھے موضوعات کے سبب کافی مقبول ہوئی۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں لکھی گئی زندانی خودنوشتوں میں حفیظ نعمانی کی آپ بیتی 'روداد قفس' بھی قابل ذکر ہے۔ حفیظ نعمانی کو اپنے رسالے 'ندائے ملت' میں 'علی گڑھ یونیورسٹی نمبر' نکالنے کی پاداش میں لکھنؤ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ سیاسی قیدی ہونے کے باوجود انھیں اخلاقی قیدیوں کے درمیان رکھا گیا۔ ان کی یہ خودنوشت ملک میں اس وقت مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی وتفریق کی داستان ہے۔ اس خودنوشت میں گرفتاری کے پس منظر سے لے کر رہائی کے بعد تک کی زندگی کو بڑے مدبرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں جیل خانے کے اخلاقی مجرموں کی زندگی اور وہاں کے قوانین، مقدمے، عدالت کی تفصیل اور ذاتی زندگی سے وابستہ باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ندائے ملت اردو کا مشہور ہفت روزہ نامہ کے علی گڑھ نمبر کو ضبط کرنے اور اس سے متعلق لوگوں کو گرفتار کرنے کے لیے جن لوگوں کو بھیجا گیا تھا ان میں بدقسمتی سے ایک فرد بھی اردو کا جانکار نہیں تھا ایسے میں اردو کے رسالہ کی کیونکر پہچان ہوتی:

> ''اب مسئلہ یہ ہے آیا کہ یہ کہتے چلے کہ اتنے بڑے انبار میں مسلم یونیورسٹی نمبر کونسا ہے اور اس سے متعلق کاغذات کون کون سے ہیں؟ یہ جاننے کے لیے جس زبان سے واقفیت کی ضرورت تھی اس کا جاننے والا ماشاء اللہ اس 252 کے لشکر میں ایک بھی نہیں تھا۔
> سبحان اللہ والحمد! کیا جواب ہے انتظامیہ کی اس خوش انتظامی کا کہ جس مجرم کی تلاش میں ایک ہزار کا لشکر جرار روانہ کیا گیا اس میں مجرم کو پہچاننے والا ایک بھی نہیں ہے۔''

(113 ص۔ روداد قفس۔ سیکنڈ ایڈیشن، حفیظ نعمانی)

مولانا آزاد کے 'تذکرہ' کو بھی زندانی خودنوشت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس خودنوشت کو انھوں نے رانچی میں بنگال بدری کے دوران 1916 میں اپنے ایک عزیز دوست مرزا فضل الدین کے بے حد اسرار پر لکھا تھا۔ مولانا آزاد اس کے اشاعت کے میں حق میں قطعی نہیں تھے اس وجہ سے مرزا صاحب نے آزاد کے علم لائے بغیر اس کی اشاعت کرنے کا اعلان کر دیا کسی طرح یہ بات مولانا آزاد کو معلوم ہو گئی اور انھوں نے سختی سے اشاعت سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے تقریباً 5 ماہ تک اس کی اشاعت منقطع رہی۔ کچھ وقت بعد مرزا صاحب رانچی تشریف لے گئے اور بصد اسرار مولانا کو اشاعت کے لیے رضامند کیا۔ ضخامت کی وجہ سے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کی پہلی جلد تو منظر عام پر آ گئی لیکن دوسری جلد کے منظر عام پر آنے سے پہلے حالات نے ایک نیا موڑ لیا اور مرزا فضل الدین کلکتہ چھوڑ کے پنجاب چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا آزاد نے بہت کوشش کی لیکن دوسری جلد دستیاب نہ ہو سکی۔ تذکرہ واحد ایسی خودنوشت ہے جس میں مصنف کی ذات اول تا آخر پس پردہ رہتی ہے۔ اپنی خودنوشت میں انھوں نے تاریخ اسلام کے بعض ان عظیم اور نامور شخصیتوں کی سوانح حیات لکھی ہے جنھیں مولانا آزاد اپنا ہیرو مانتے تھے۔ جہاں انھوں نے خود سے متعلق گفتگو کی ہے وہ اشاروں اور کنایوں کی نذر ہو گئی ہے، جس سے مولانا آزاد کی زندگی سے متعلق کوئی بھی بات واضح نہیں ہوتی ہے۔ عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ اشعار کے لامحدود استعمال نے اس کتاب کو عام قاری کے لیے مشکل بنا دیا ہے۔

ان خودنوشت سوانح حیات کے علاوہ بھی قلم کاروں نے اپنی زندانی زندگی سے متعلق مختلف واقعات اور احساسات کا ذکر اپنے خطوط و شعری مجموعات کے دیباچوں میں کیا ہے جس سے ہم کو ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا علم ہوتا ہے۔ ان خودنوشتوں سے اردو زبان و ادب کے شعرا و ادبا کے سیاسی و سماجی معاشرتی اقتصادی و اخلاقی شعور کا پتا چلتا ہے۔ اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ سوانح نگاری غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ ☐☐☐

Sadaf Nafees
D/o. Nafees Azmi
House Number 216
Near Shri Ram Ice Factory
Mewa Chay Ki Gali,
Mohalla Malik Tahir Pura
Mau Nath Bhanjan, Mau-275101 (U.P.)

ریحانہ بشیر

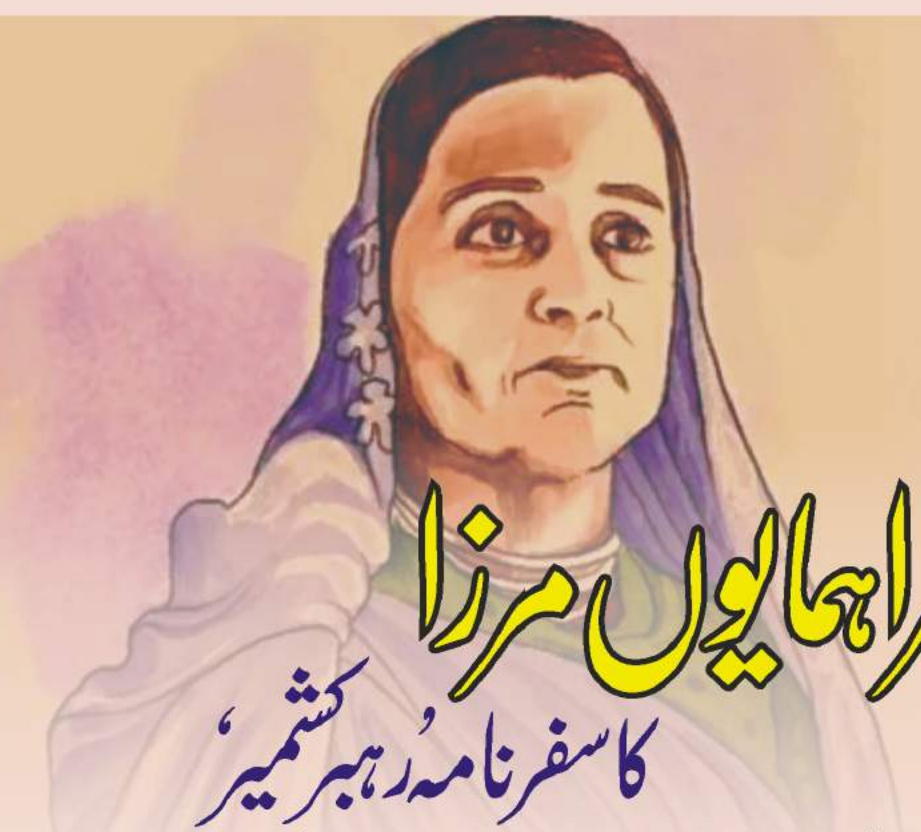

صغرا ہمایوں مرزا

کا سفرنامہ ’رہبر کشمیر‘

اردو ادب کے فروغ میں جہاں مرد قلم کاروں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہیں خواتین قلم کار بھی ادب کی ترقی و ترویج میں پیش پیش رہی ہیں۔ جب ہم اردو ادب کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواتین قلم کاروں نے اُس وقت ادب کی خدمات انجام دی ہیں جب اُن کا گھر سے باہر نکلنا بھی معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن حالات چاہے جو بھی رہے ہوں اور مراحل جتنے بھی کٹھن اور مشکل رہے ہوں؛ اُنھوں نے پوری دلچسپی، ہمت اور لگن سے اپنی خدمات کو سرانجام دیا ہے۔ خواتین قلم کاروں نے ادب کی متنوع اصناف میں مرد ادیبوں کے شانہ بہ شانہ چل کر اپنے اندر موجود تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لاکر ادب میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔ حالاں کہ یہ بات بھی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے کہ موجودہ دور میں معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں جہاں مرد کا کردار مرکزیت کا حامل ہے اُسی طرح خواتین کے تعمیری کردار یا تعمیری شعور کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ خواتین کے تخلیقی شعور نے جہاں دیگر علوم وفنون میں مرکزیت حاصل کی ہے وہیں ادب نے بھی اُن کے تخلیقی شعور اور اختراعی ذہن کو قبول کرلیا ہے۔ جہاں تک اردو ادب میں خواتین کے رول کی بات ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ادب کی بڑی اصناف جیسے شاعری، ناول، افسانہ، ڈراما وغیرہ میں خواتین قلم کار بھی پیش پیش رہی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُنھوں نے اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ادب کے ذخیرے میں ایسے اضافے کیے ہیں جنھیں ہر دور میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ادب کی چند اہم خواتین قلم کاروں میں صغرا ہمایوں مرزا کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ وہ ادیبہ، شاعرہ، مدیرہ اور ایک سماجی خدمت گزر خاتون کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ یہاں یہ بات ضمنی طور پر کہنا چاہوں گی کہ بیسویں صدی کی جن خواتین نے ادب، معاشرہ اور قوم وملت کے لیے خود کو وقف کیا، اُن میں صغرا ہمایوں مرزا کا نام بھی شامل ہے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہندوستان میں قدامت پسندی کا بڑا دخل تھا اور بالخصوص حیدرآباد اس معاملے میں اور بھی زیادہ سخت تھا۔ پردے کے بغیر عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا اور محفلوں میں بولنا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن صغرا نے جرأت مندی کا ثبوت دے کر حصاروں اور بندشوں کو توڑ کر اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور پردے سے نکل کر اُنھوں نے معاشرے میں علمی وسماجی خدمات سے جو شناخت قائم کی ہے اُس کی ضامن پوری تاریخ دکن ہے۔ اُنھوں نے اپنے تخلیقی شعور اور صلاحیتوں سے ادب اور سماج کے تئیں جو خدمات انجام دیں اُس کی نظیر شاید ہی ملے گی۔

صغرا ہمایوں مرزا کی پیدائش 1884 میں حیدرآباد میں ہوئی۔ اُن کے والد ڈاکٹر سید صفدر علی حیدرآباد کی نظام حکومت کی فوج میں سرجن کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ ابتدائی تعلیم روایتی طور پر گھر سے ہی ہوئی ہے۔ وہ ابتدا سے ہی پڑھنے لکھنے سے خاصی دلچسپی رکھتی تھیں۔ تعلیم کے اسی ذوق نے اُن میں کہانی لکھنے کا شوق پیدا کیا اور پھر وسیع مطالعے اور زندگی کے تجربات نے ان کے فہم وادراک اور تخیل کو وسعت بخشی۔ کم عمری میں ہی اُن کے والد کا انتقال ہوا اور چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش اور تعلیم و

تربیت کا ذمہ اپنے سر لیا۔ صغرا ہمایوں مرزا کی شادی فریاد عظیم آبادی کے فرزند سید عاشق حسین المعروف بہ سید ہمایوں مرزا سے دسمبر 1901 میں ہوئی۔ صغرا ہمایوں مرزا ایک خانہ دار خاتون تھیں اور اپنی ہر ذمہ داری کو بخوبی انجام دیتی تھیں۔ والد کے گزرنے کا غم تو تھا ہی لیکن اولاد نہ ہونے کے غم نے بھی انھیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا۔ حالاں کہ 1904 میں انھوں نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا لیکن ایک سال کے بعد ہی وہ اس دنیائے فانی سے چل بسی۔ اولاد کے کھونے کا غم ایک عورت کے لیے بہت ہی دردناک ہوتا ہے۔ اس غم کو بھی صغرا ہمایوں مرزا نے نہایت ہی صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ اس کے بعد تاعمر وہ اولاد کے سکھ سے محروم رہیں۔ اس غم کو صغرا ہمایوں مرزا نے خود پہ کبھی حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ دوسروں کی اولادوں کو شفقت کی نگاہوں سے دیکھتی رہیں اور خاص خیال بھی رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے اسی غم میں زندگی گزارنے کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ پوری طرح خود کو تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف رکھا۔ زندگی کا ایک اہم حصہ سماجی کاموں میں صرف کیا اور عورتوں کو جو مسائل درپیش تھے انھیں دور کرنے کی کوشش میں لگ گئیں۔ 1958 کو 75 برس کی عمر میں صغرا ہمایوں مرزا کا انتقال اُن کے آبائی وطن حیدرآباد میں ہوا۔

صغرا ہمایوں مرزا اردو ادب میں کئی جہات سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ اُنھوں نے ناول بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے۔ اُن کے ناول ''مشیر نسواں'' (1906)، ''سرگزشت ہاجرہ'' (1926)، ''موہنی'' (1929)، ''بی بی طور کا خواب'' (1952)، اور دیگر کتابیں جن میں ''تحریر النساء''، ''آوازِ غیب'' اور ''مجموعۂ نصائح''، وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ دو شعری مجموعے ''سفینۂ نجات'' (1941)، ''انورِ پریشاں'' (1949) بھی شائع ہوئے ہیں۔ اُن کی شادی ایک بیرسٹر سے ہوئی تھی تو ظاہر سی بات

ہے کہ بیرون ریاست اور ملک جانے کا موقع بھی ملا۔ اس سے اُن کو سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ سفرنامے لکھنے کا مواد بھی دستیاب ہوا۔ صغرا ہمایوں مرزا نے مختلف جگہوں کی سیر و سیاحت کی اور وہاں کے حالات، رہن سہن، بود و باش اور خورد و نوش سے واقفیت بھی حاصل کی اور انھیں سفرنامے کی صورت میں قلم بند کیا۔ اس سلسلے میں اُن کے متعدد سفرنامے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ جن میں ''سیر بہار و بنگال'' (1910)، ''سیاحت جنوب ہند'' (1912)، ''سفرنامۂ ولایت'' (1916)، ''سفرنامۂ یورپ (دو جلدیں)'' (1924)، اور ''رہبر کشمیر'' (1928) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے خواتین میں بیداری لانے کے لیے 1912 میں لیڈی قدیر جنگ مرحوم کی مشاورت سے انجمن خواتین اسلام قائم کی، جس کی صدر لیڈی قدیر جنگ تھیں۔ اُن کی زندگی کا ایک اور اہم کارنامہ ''صفدریہ گرلس ہائی اسکول ہمایوں نگر'' ہے جس کا قیام حیدرآباد میں بیسویں صدی میں عمل میں آیا اور صغرا ہمایوں مرزا اس کی بنیاد گزار ہیں۔ آج اکیسویں صدی میں بھی اس اسکول میں نئی نسل کو تعلیم سے آراستہ کرنے اور ان کی رہنمائی کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے خواتین کی ترجمانی کے لیے ایک رسالہ ''النساء'' (1920) کا اجرا کیا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہی صغرا نے سفرنامے لکھنے شروع کیے۔ جس کا سلسلہ 1910 میں ''سیر بہار و بنگال'' سے شروع ہوا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے وہ سفرنامے لکھتی رہیں۔ اُنھوں نے ''رہبر کشمیر'' کے عنوان سے ایک سفرنامہ شائع کیا ہے۔ مذکورہ سفرنامے کا ذکر نقادان ادب نے بہت کم کیا ہے جس کی وجہ نقادان ادب ہی بہتر جانتے ہیں۔ بہر کیف یہ سفر اُنھوں نے 8 جولائی 1928 میں کیا تھا۔ سفرنامے کی شروعات دراصل کشمیر جانے کے سبب سے ہوتی ہے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں پہلے سے ہی کشمیر جانے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن اُن کے شوہر کی خراب صحت کا تقاضہ، موسمی حالات اور دوستوں کے اصرار نے اُنھیں کشمیر جانے پر آمادہ کیا۔ اس ضمن میں صغرا لکھتی ہیں:

> ''1928 میں بیرسٹر صاحب کا مزاج ناساز تھا کرنل اینڈرسن رزیڈنسی سرجن کا علاج تھا انھوں نے کشمیر بغرض تبدیل آب و ہوا جانے کا مشورہ دیا یا کلمبو (سیلون) جانے کا۔ آخر وقت تک ہمارا خیال کلمبو جانے کا تھا لیکن میرے چند عزیزوں کا اصرار ہوا کہ ہم کشمیر جائیں اخبارات سے معلوم ہوا تھا کہ کلمبو میں سخت بارش ہو رہی تھی اس لیے کشمیر جانے کا قصد مصمم کر لیا بروز شنبہ 8 جولائی 1928 م 18 محرم 1340ھ شب کے نو

بجے سکندر آباد ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئے۔''

صغرا ہمایوں مرزا کو نور جہاں کے مزار پر جانے کا شوق تھا جو کہ لاہور میں تھا لہذا جب کشمیر جانے کا ارادہ ہوا تو اُنھوں نے پہلے لاہور جانے کی خواہش ظاہر کی اور پھر لاہور سے کشمیر کے سفر پر روانہ ہوئیں۔ انھوں نے نور جہاں کے لیے ٹرین میں ایک نظم بھی لکھی جو اُنھوں نے لاہور پہنچ کر علامہ اقبال کو بھی دکھائی تھی۔ وہ نظم بھی اس سفرنامے میں شامل ہے۔

سفر نامہ ''رہبر کشمیر'' 47 عنوانات پر مشتمل ہے۔ اس کا دیباچہ عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے۔ فصاحت جنگ جلیل اور احمد حسین امین جنگ نے اس سفرنامے پر تبصرے لکھے ہیں۔ مقدمے سے قبل اُن تبصروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس سفرنامے کا مقدمہ صغرا ہمایوں نے خود لکھا ہے۔ جس میں اُنھوں نے کشمیر کے جغرافیائی و تاریخی حالات نیز کشمیر کی قدرتی خوبیوں، اسلامی عہد حکومت اور کشمیر کے آنے جانے کے راستوں کے حوالے سے تفصیلی انداز میں جانکاری فراہم کی ہے۔ مقدمے میں ان سب باتوں کی جانکاری فراہم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ صغرا ہمایوں مرزا اپنے قارئین کو نہ صرف کشمیر کی سیر وسیاحت کے دوران پیش آئے حالات و واقعات یا یہاں کے خوب صورت مناظر کی قلمی تصویریں دکھانا چاہتی تھیں بلکہ وہ یہاں کی جغرافیائی اور تاریخی نیز سیاسی منظر نامے کے حوالے سے بھی معلومات بہم پہنچانا چاہتی تھیں۔ حالاں کہ وہ خود بھی اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ براہ راست کشمیر کے سفر وسیاحت کے حالات واقعات کو قلم بند کرنے سے قبل یہاں کے جغرافیائی و تاریخی حالات کو بھی بیان کر دینا اس لیے اہم سمجھتی ہیں تا کہ قارئین نہ صرف یہاں کے قدرتی مناظر اور خوب صورتی سے محظوظ ہو سکیں بلکہ یہاں کی جغرافیائی اور تاریخی وثقافتی حالات و واقعات کی بھی سدھ بدھ حاصل ہو جائے۔ میرے خیال سے یہ ایک کامیاب سفر نامہ نگار کی خصوصیت ہے کہ وہ سفرنامے کی صورت میں قارئین کو سیر وسیاحت کے ساتھ ساتھ متعلقہ جگہ کے جغرافیائی اور تاریخی وثقافتی پہلوؤں سے بھی باخبر کرے۔ اس تناظر میں وہ رقم طراز ہیں:

''قبل اس کے کہ میں اپنے حالیہ سفر وسیاحت کشمیر جنت نظیر کے حالات وواقعات اپنی ڈائری (روزنامچہ) میں سے نقل کروں اور ایک کتاب کی شکل میں پبلک کے سامنے پیش کروں یہ مناسب خیال کرتی ہوں کہ مختصر طور پر کشمیر کے جغرافی وتاریخی حالات اور وہاں کی قدرتی خوبیوں کا بھی کچھ تذکرہ کروں تا کہ ناظرین و ناظرات کی دلچسپی کا بھی کچھ سامان مہیا ہو جائے اور اس کو کتاب کا مقدمہ کر دوں۔''

(رہبر کشمیر، از صغرا ہمایوں مرزا، ص 1)

''رہبر کشمیر'' کے عنوان سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سفرنامے میں کشمیر کی سیر وسیاحت کے حالات و واقعات کا تذکرہ ہوگا لیکن جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ صغرا ہمایوں لاہور بھی جانے کی خواہش رکھتی تھیں لہذا اُنھوں نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور پہلے حیدرآباد سے لاہور گئیں اور پھر لاہور سے کشمیر کا سفر کیا۔ لاہور کے سفر کے دوران اُنھوں نے راول پنڈی، قلعہ لاہور، لاہور کی دعوتوں کے ساتھ ساتھ لالہ لاجپت رائے کی وفات کے حوالے سے بھی تذکرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے امرتسر، دہلی، علی گڑھ، اجمیر شریف اور اجمیر کے میوزیم کے دوران پیش آئے حالات و واقعات کو بھی قلم بند کر دیا ہے۔ صغرا ہمایوں مرزا نے نہ صرف خود کشمیر کی سیر وسیاحت کا لطف اُٹھایا ہے بلکہ لوگوں سے کشمیر کے حوالے سے جانکاری حاصل کر کے اپنے قارئین کو گھر بیٹھے کشمیر اور کشمیریت کا احساس کرایا۔

صغرا ہمایوں مرزا نے کشمیر کی سیر وسیاحت میں اچھا خاصا وقت گزارا ہے۔ یعنی وہ اس سفر سے چھ ماہ بعد حیدرآباد واپس لوٹیں۔ لیکن اس دوران اُنھوں نے نہ صرف کشمیر پر سفرنامہ تحریر کیا بلکہ کشمیر کو خود جیا بھی ہے۔ اُنھوں نے ہاؤس بوٹ، گیسٹ ہاؤس، لکڑی و چاندی کی دوکانوں،

میوزیم، سلک فیکٹری وغیرہ کا خوب تذکرہ کیا ہے۔ ہاؤس بوٹ اور گیسٹ ہاؤس میں رہن سہن، کھان پان کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ اُنھوں نے چشمہ شاہی، ہارون، شالی مار باغ، پہل گام، گلمرگ، ڈل جھیل اور نشاط باغ جیسے سیاحتی مقامات کی سیر کی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات جیسے گاندربل، اچھ بل، زڈ بل کا بھی سفر کیا۔ گاندربل کا اُنھوں نے خصوصی تذکرہ کیا ہے؛ وہاں کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے اور وہاں کی پرانی عمارتوں کا خاص تذکرہ کیا ہے نیز وہاں کی مشہور جھیل مانس بل جھیل کی بھی سیر کی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُنھوں نے کشمیر کی مشہور جامع مسجد جو سری نگر میں واقع ہے اور پتھر کی مسجد کے ساتھ ساتھ یہاں کی درگاہوں اور مزارات کے علاوہ مندر کھیر بھوانی کی بھی سیر کی ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے ڈل جھیل میں شام کے وقت کشتیوں کے میلے اور امام حسینؓ کی مجلس کا بھی خوب نقشہ کھینچا ہے۔ جہاں جہاں بھی اُنھیں دعوت پر بلایا گیا؛ اُن دعوتوں کا بھی اُنھوں نے تذکرہ کیا ہے۔ کشمیری زبان اور لباس کے ساتھ ساتھ کشمیری کانگڑی کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے غریبوں کے ایک محلے کا بھی تذکرہ کیا ہے اور وہاں کی غلاظت، گندگی اور گندے لوگوں کے غلیظ اور گندے لباس اور جسم کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اُن کا تقابل حیدرآبادی غریب مسلمانوں سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ (سری نگر کے غریب مسلمان) اس قدر غلیظ ہے کہ ایسی غلاظت اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہمارے حیدرآباد کے غریب مسلمان چوتھے پانچویں دن نہاتے اور کپڑے بدلتے رہتے ہیں۔'' وہ لکھتی ہیں:

> ''افسوس اُن مسلمانوں پر ہے جن کے مذہب نے اس قدر صفائی اور طہارت کی تعلیم دی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں بہت جہالت ہے۔ مشائخ تو یہاں سینکڑوں ہیں جو پیری مریدی کرتے یا مزاروں پر مجاوری کرتے ہیں، مفت کا کھاتے ہیں مگر یہ نہیں ہوتا کہ ان غریب مسلمانوں کو تعلیم دیں اور کچھ نہیں تو صفائی ستھرائی کی تلقین کریں۔'' (ص35)

اُنھوں نے یہاں کے فنِ تعمیر کو سراہا اور اپنے سفرنامے میں ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھنے والا گویا خود اپنی آنکھوں سے اُس مقام کو دیکھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر کشمیر کی مشہور و معروف جامع مسجد کے حوالے سے اُنھوں نے نہ صرف تاریخی حقائق بیان کیے ہیں بلکہ اس مسجد کا بہترین لفظی نقشہ بھی کھینچا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ کشمیر کی جامع مسجد ایک تاریخی مسجد ہے جسے کئی بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنی مالی امداد سے تعمیر کروایا ہے۔ یہ مسجد کئی بار نذرِ آتش بھی ہوئی اور ہر بار اس کی مرمت بھی کروائی گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس مسجد کے حوالے سے اُنھوں نے تمام واقعات کا مختصراً ہی سہی مگر احاطہ ضرور کیا ہے۔ وہ مسجد کی تعمیری ساخت سے بے حد متاثر ہوئیں جس کا نقشہ وہ کچھ یوں کھینچتی ہیں:

> ''یہ مسجد فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ۔ سلطان سکندر نے جو 796ھ سے 820ھ تک کشمیر کا حکمران تھا اس مسجد کی بنا 801ھ میں ڈالی، 804ھ میں اس کی تعمیر مکمل کی۔ مادہ تاریخ جامع مسجد کشمیر ہے مسجد کا صحن بہت وسیع ہے۔ چاروں طرف عمارت ہے صحن میں چنار کے بڑے بڑے درخت ہیں جن کو حسن شاہ نے 885ھ میں نصب کیا تھا۔ حسن شاہ سکندر شاہ کا پر پوتا تھا اور سلطان زین العابدین معروف بڈشاہ کا پوتا تھا۔ اس مسجد کے تین عظیم الشان پھاٹک ہیں۔ ایک پھاٹک پر مسجد کی تاریخ کندہ ہے اور چند کتبے چاروں طرف بڑے بڑے دلان ہیں۔ چھت لکڑی کی ہے جو 378 ستونوں پر قایم ہے۔ ہر دالان کے وسط میں ایک مینار ہے، بہت بلند ہے اور ہر مینار لکڑی کے آٹھ ستونوں پر قایم ہے اس قسم کے 35 ستون مناروں کے نیچے ہیں۔ یہ چوبی ستون دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں دیکھ کر انسان دنگ ہو جاتا ہے کہ اس قدر بڑے بڑے لکڑی کے ستون کس طرح لائے گئے اور نصب کیے گئے ہوں گے۔''

(رہبرِ کشمیر، از صغرا ہمایوں مرزا، ص48-49)

صغرا ہمایوں نے کشمیر کے مختلف مقامات اور وہاں کی عمارتوں کا تاریخی منظرنامہ پیش کیا ہے جو بہ ظاہر بہت ہی مشکل کام ہے لیکن اُنھوں نے جہاں کئی مقامات کے ثقافتی عناصر کو پیش کیا وہیں اُن کے جمالیاتی عناصر کو گرفت میں لے لیا ہے۔ کشمیری کاریگری، رہن سہن، عادات و اطوار، اقدار اور روایات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ اُنھوں نے کئی پہلوؤں کے ساتھ اس سفرنامے کو اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس سفر کے دوران اُن کی کوشش یہ رہی ہے کہ جو کچھ اُنھوں نے دیکھا ہے اُس کے تعلق سے معمولی سی معمولی جانکاری بھی اُن سے نہیں چھوٹی ہے۔ مثال کے طور پر مانجھیوں یعنی جو ہاؤس بوٹ اور کشتیاں وغیرہ چلاتے ہیں کی عجیب وغریب لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ مانجھی جب لڑتے ہیں تو ماں بیٹی، ساس بہو یا بیٹا باپ لڑتے لڑتے مار پیٹ تک پہنچ جاتے ہیں۔ بہر صورت سفرنامہ ''رہبرِ کشمیر'' کشمیر کے صحت افزاں مقامات کے حوالے سے قاری کی دلچسپی کا باعث تو ضرور بنا ہے لیکن قاری کے دل میں یہ خواہش بھی

ضرور پیدا کرتا ہے کہ وہ بھی اُن مقامات کی سیر کرے اور اُنھیں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس سفرنامے میں اُس عہد کے کشمیر کے حالات واقعات، وہاں کی معاشرتی وتہذیبی زندگی کی جھلک، درگاہوں اور مزارات کی تعمیر نیز درگاہوں اور مندروں کے گنبد اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے کس قدر مختلف ہے؛ ان سب باتوں کا تذکرہ مذکورہ سفرنامے میں خوب صورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بہرکیف صغرا ہمایوں مرزا نے کشمیر کی سیر وسیاحت کے دوران وہاں کی قدرتی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ تاریخ، ثقافت اور اقدار کے مختلف رنگ پیش کیے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر کے آسان اور غیر معمولی طرزِ نگارش کے ساتھ کشمیر پر اپنا سفرنامہ قلم بند کیا ہے۔ اُن کی ادبی حیثیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف بعد کی خواتین تخلیق کاروں کے لیے راستہ ہموار کیا ہے بلکہ نئی راہ بھی کھول دی ہے۔ جن پر آج کی خواتین قلم کار آسانی سے اپنا سفر طے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور سماج کے مختلف مسائل سے دوچار ہونے کے بعد اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی تخلیقات میں اُن تمام مسائل کو نہ صرف پیش کرتی ہیں بلکہ اپنی فہم وفراست کی حد تک اُن مسائل کا حل بھی پیش کرتی ہیں۔

□□□

Ms Rehana Basheer
Research Scholar
Maulana Azad National Urdu University
Urdu University Road, Near LNT Towers,
Telecom Nagar, Gachibowli, Hyderabad,
Telangana 500032
ilhanrehana@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................
بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔
میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009
میں جمع کروادیا ہے۔
آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....
پتہ : ....
....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر واحد نظیر

فکری توازن کی نمائندہ شاعرہ

رفیعہ شبنم عابدی

خالقِ کائنات نے جس شے یا وجود کی تخلیق کی، ان کی انفرادی اہمیت اور طاقت ہے۔ سورج کی توانائی، زمین کی قوتِ نمو، آگ کی حرارت اور پانی کی سیرابی سب ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ کوئی کسی کا بدل نہیں اور کسی ایک کے بغیر کائنات تو کیا زندگی کے باقی رہنے کا تصور محال ہے۔ ان سب کی اہمیت ایک خاص توازن پر منحصر ہے۔ جسے ہم ذہنی اور فکری ترجیحات کے مطابق نظامِ خداوندی یا قانونِ فطرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس توازن کو نظامِ خداوندی سے تعبیر کریں یا قانونِ فطرت سے یا اور کسی نام سے، اتنا تو مسلّم ہے کہ اس کے بغیر حیات و کائنات کا ارتقا ممکن نہیں۔

سورج کا توازن بگڑ جائے تو اس کی کرنیں شبنمی پتوں کی غذائیت کا ذریعہ نہیں بلکہ زرخیز زمینوں کی کوکھ تک کو بنجر کر دیتی ہیں۔ زمین کا مزاج غیر متوازن ہو تو وہ اناج نہیں آگ اگلنے لگتی ہے۔ آگ کی حرارت بے قابو ہو جائے تو توے سے نرم روٹیاں نہیں، گھر کی خاکستری مقدر ہو جائے۔ پانی بے اعتدالی اختیار کر لے تو سیرابی نہیں، سونامی وجود پذیر ہو۔ گویا کسی بھی وجود کی اہمیت کا انحصار اس پر نہیں کہ وہ طاقت ور کتنا ہے بلکہ وہ انسان اور انسانی کائنات کی ترویج و تزئین میں کتنا مفید اور معاون ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی روشن ہوتا ہے کہ وجود وہی نفع بخش ہو سکتا ہے، جس میں توازن ہو۔ خواہ انسان و حیوان ہوں یا بے جان اشیا۔

وسیع تناظر میں مذہبی قوانین، سماجی ضوابط اور ادبی ترجیحات سب کا مقصد صرف اور صرف اتنا ہے کہ انسان اور کائنات کا توازن قائم رہے۔ یہ اور بات ہے کہ مذہب، سماج اور ہر جگہ دیگر شعبہ ہائے حیات میں اور ہر دور میں ایسے افراد موجود ہیں جنھوں نے اپنی منفی تعبیروں اور شیطانی تاویلوں سے گمراہی کو فروغ دیا۔ مذہب کو شکم پروری، سماج کو استحصال اور ادب کو ذہنی تعیش کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان خامیوں کی اصلاح کے لیے جو تحریکیں وجود میں آئیں، ان میں بھی ایسے افراد موجود ہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی کی شاعری کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اُن تجربوں اور مشاہدوں کو تخلیقی پیرہن عطا کیے جو خوب صورت حیات و کائنات کے ضمانت دار ہیں۔ انھیں یہ عرفان حاصل ہے کہ خرابی مذہب، سماج اور ادب میں نہیں بلکہ ان سے متعلق کچھ افراد میں ہے۔ لہٰذا وہ ایسے

افراد کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں، نہ کہ مذہب سے انکار، سماج کی تردید اور ادب کی تنسیخ کے نعرے لگاتی ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے 'بھیگی آنکھوں کا موسم'، 'اگلی رُت کے آنے تک'، 'آنگن آنگن پُروائی' اور 'نئی گھٹائیں اُتر رہی ہیں' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ تقریباً چالیس برسوں پر محیط شعری سفر میں کہیں ان کے قدم تھکے تھکے محسوس نہیں ہوتے۔ فکر، زبان اور موضوع ہر نقطۂ نظر سے ایک خاص توازن اور وقار قابلِ توجہ ہے۔ غزلیں ہوں یا معرا، آزاد اور نثری نظمیں رفیعہ شبنم عابدی کے مثبت اور متوازن تخلیقی رویوں کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ نظامِ حیات کے جسم میں پل رہے ناسور کے علاج کی تدابیر کرتی ہیں، اس کے وجود کی منحرف نہیں:

روایتوں کا تحفظ عزیز تھا ورنہ
اک اجنبی مرا ملبوس بن گیا ہوتا

میرے قدموں تلے جنت ہوئی تعمیر مگر
میری قسمت ترے ہاتھوں کی لکیروں میں رہی

یہ شام کا بازار ہے یا کرب و بلا ہے
ہر خواب مرا وقت کے نیزے پہ چڑھا ہے

ان اشعار سے رفیعہ شبنم عابدی کی ذہنی تربیت، فکری نہج، قرآن و حدیث کی تعلیمات سے ذہنی ہم آہنگی اور اسلامی تاریخ سے واقفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ جس روایت کے تحفظ کی بات کر رہی ہیں وہ خالص مذہبی ہے۔ اس کی تصدیق مصرعِ ثانی 'اک اجنبی مرا ملبوس بن گیا ہوتا' کے کلیدی لفظ 'ملبوس' سے ہوتی ہے۔ قرآنِ پاک میں شوہر اور بیوی کے حوالے سے ارشادِ خداوندی ہے کہ ھُن لباس لکم وانتم لباس لھُن (وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو) یعنی شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے لباس ہیں۔ ظاہر ہے کسی اجنبی کا ملبوس ہونا دراصل ایسے جسمانی رشتے کا مرتکب ہونا ہے جو صرف شوہر اور بیوی کے لیے جائز ہے۔ شاعرہ نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ بات کہہ دی ہے کہ اس روایت کا تحفظ دراصل کسی خاتون کی عزت و عصمت کے تحفظ کی ضمانت ہے۔

دوسرا شعر مرداساس معاشرے میں خواتین کے استحصال کی اُس انتہائی قبیح صورتِ حال کو آئینہ کرتا ہے، جہاں خواتین کے مذہبی حقوق بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ رفیعہ شبنم عابدی نے نہایت خوب صورتی سے حدیث کی روشنی میں عورت کی عظمت اور عملی زندگی میں عورت کی بے بسی کو پیش کر کے متضاد صورتِ حال کو پیش کیا ہے۔ اس شعر میں صرف تانیثی احتجاج ہی نہیں بلکہ یہ سوال بھی پوشیدہ ہے کہ جب عورت کا مقدر اور اس کا وجود، مرد کے ہاتھوں کی لکیروں کے تابع ہے تو پھر اس کے قدموں تلے تعمیر کی گئی جنت اس کی کس طرح رہ سکی؟ تیسرا شعر اسی فکر کی توسیع ہے۔ شاعرہ نے اس شعر میں بازارِ شام اور کربلا کے جاں کاہ منظر کے تناظر میں یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ وہاں نواسۂ رسول ﷺ کا سرِ مبارک نیزے کی نوک پر تھا اور یہاں میرے خواب نیزۂ وقت کی نوک پر ہیں۔ تلمیح و تاریخ کے توسط سے عورت کی بے بسی اور اس کے صبر و تحمل کا تخلیقی اظہار قابلِ داد ہے۔ گویا ان اشعار میں مذہبی اقدار کے مکمل احترام کے ساتھ ان غلط رویوں کی مذمت کی گئی ہے جو کسی نہ کسی سطح پر مذہب کے راستے نظامِ زندگی میں دخیل ہو گئے ہیں۔

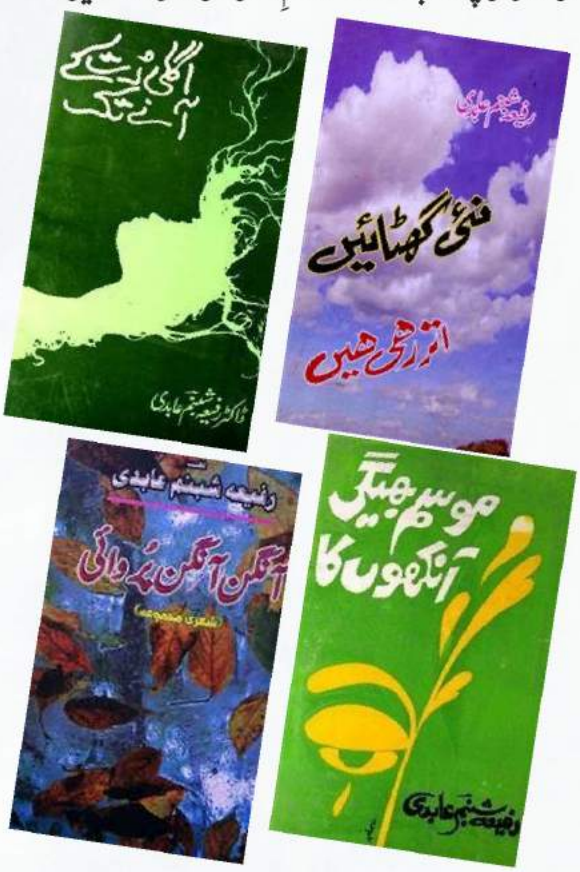

رفیعہ شبنم عابدی کی شاعری میں ایک ایسی عورت کی شبیہ ابھرتی ہے جو جہاں دیدہ اور نبض شناس ہے۔ یہ معاشرے کی باغی نہیں، اس میں در آئی خامیوں کی اصلاح کی حامی ہے۔ شعری مجموعہ 'آنگن آنگن پروائی' کے پیشِ لفظ بہ عنوان 'پروائیاں چلیں' میں لکھتی ہیں:

''میرے یہاں جذبوں کی خواب آگیں فضا شاید ہی ملے،
ہاں البتہ ہلکے ہلکے شعلوں کے بیچ رشتوں کی سچائیاں اپنی
تابناکی کے ساتھ ممکن ہے کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے

میں کامیاب ہو جائیں، ویسے بھی میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میرا فن کسی کے خیال کا پرتو ہو یا کسی فیشن زدہ نظریے کا اشتہاری پلندہ۔ اتفاقاً کہیں، کسی جگہ خیال یا اظہار میں کوئی مماثلت یا توارد نکل آئے تو اور بات ہے، ورنہ نو، دس سال کی عمر سے لے کر آج تک میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے، دیکھا ہے، وہی لکھا ہے۔ میری شاعری میرے فکر و احساس کے ارتقائی سفر کی داستان ہے، میرا ایک ایک لفظ میری اپنی ملکیت ہے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفیعہ شبنم ایسی جینوئن شاعرہ ہیں جو تجربات اور مشاہدات کو تخلیقی نہج عطا کرتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ بنیادی چیز رشتے کی حفاظت ہے اور تمام شکوے گلے اسی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ برسرِ اقتدار طبقے کے ظلم و جور کے خلاف صرف احتجاج نہیں کرتیں بلکہ اس کے مخلصانہ رویوں کا اعتراف بھی کرتی ہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی اپنی شاعری میں لفظوں کو ایسا سیاق عطا کرتی ہیں کہ وہ استعارہ اور علامت بن کر جداگانہ معنی کے حامل ہو جاتے ہیں۔ یہ تخلیقی رویہ ان کے اظہار کی ایسی طاقت ہے جو شعر کو ایجاز اور تہہ داری سے ہم کنار کرتی ہے۔ ساتھ ہی تلخ سے تلخ حقائق اس سلیقے سے شعر بن جاتے ہیں کہ مخاطب دل برداشتہ نہیں ہوتا بلکہ بیان کردہ حقائق کے آئینے میں اپنی شبیہہ کا معائنہ کرنے لگتا ہے:

وہی عقاب، وہی فاختہ، وہی چیخیں
تمھارا شہر بھی میرے ہی گاؤں جیسا ہے

کچھ اقتباس تو کچھ حاشیے حوالے ہیں
تمھارا چہرہ تو بالکل کتاب جیسا ہے

میرے آنگن کی چڑیو محتاط رہو
پیڑ پہ اکثر سانپ بھی آیا کرتے ہیں

عقاب، فاختہ، چیخیں، اقتباس، حاشیے، حوالے، کتاب، چڑیا، پیڑ، سانپ تمام لفظ علامتی اور استعاراتی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ عقاب اور فاختہ کا استعمال رفیعہ شبنم عابدی اپنی غزلوں اور نظموں میں بار بار کرتی ہیں۔ ان کے یہاں عقاب ظالم و جابر مرد اور فاختہ مظلوم و مجبور عورت کا استعارہ ہیں۔ گاؤں میں عقاب حقیقی تھے اور فاختہ کی چیخیں بھی حقیقی تھیں۔ شہر میں عقاب اور فاختہ کی چیخیں استعاراتی ہیں۔ ایک جگہ مظہرِ فطرت اور ایک جگہ انسانی جبر اور استحصال زدگی کا نتیجہ۔ اس طرح شہر کے سیاق میں عقاب اور فاختہ جابر و مجبور کا استعارہ بن گئے ہیں۔ اگر گاؤں کے عقاب اور فاختہ کو بھی استعاراتی تصور کریں تو اس شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ فرسودہ روایتوں میں جکڑے ہوئے گاؤں اور ترقی یافتہ تہذیب کا دعوا کرنے والے شہر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فاختائیں وہاں بھی ظلم و جبر کی شکار ہیں اور یہاں بھی۔

باقی دونوں اشعار میں بھی عقاب اور فاختہ کے کردار موجود ہیں لیکن اپنے نام کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے خصائص کے ساتھ۔ چہرے کو کتاب کہہ کر اقتباس، حاشیے اور حوالے کا ذکر محض ایک مرد کے گزرے ہوئے مشکوک لمحات کی شرح نہیں ہے۔ ایک حساس عورت کے جبر اور صبر کی کہانی بھی ہے جہاں وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لب کشائی کی جرأت سے محروم ہے۔ چہرے کی کتاب میں لکھی اجنبی کہانیوں کو پڑھ کر بھی اپنا احتجاج اس لیے درج نہیں کر پاتی کہ فاختہ کی طرح سہمی ہوئی مجبور زندگی اس کے حصے میں آئی ہے۔

آنگن کی چڑیوں کو سانپ سے محتاط رہنے کی نصیحت میں یہ کرب اور حقیقت پوشیدہ ہے کہ خطرات گھر کے باہر ہی نہیں ہیں۔ جنسی بے راہ روی اور اخلاقی پستی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب رشتوں کا احترام بھی باقی نہیں رہا۔ گھر میں آنے جانے والے عزیز و اقارب پر بھی اعتبار کرنا مشکل ہے۔ گویا فاختہ بننے کی مجبوری رشتۂ ازدواج سے منسلک ہونے کے بعد ہی پیدا نہیں ہوتی۔ معاشرے کا ڈھانچہ ایسا ہے کہ ہر عمر میں مردوں کی جیت اور عورتوں کی شکست کے اسباب مہیا رہتے ہیں۔ سماج کے تانے بانے اس طرح بنے ہی گئے ہیں کہ زندگی کے ہر موڑ پر ایثار عورتوں کے حصے میں ہی آئے۔ کم عمر بچی کو سانپ سے محتاط رہنے کی تلقین صرف حفاظت کا اشارہ نہیں ہے۔ لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن یہ عمل عقابوں کے خوف کی نفسیات کو بھی جنم دیتا ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی کی غزلیں ایسے بے شمار نسائی مسائل اور جذبات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

فکر و اسلوب کے یہی رویے رفیعہ شبنم عابدی کی نظموں میں بھی واضح ہیں۔ پابند، معرا، آزاد اور نثری نظموں میں گرچہ عالمی اور ملکی مسائل بھی موضوع بنے ہیں لیکن زیادہ تر نظمیں عورتوں کے مسائل و معاملات سے ہی متعلق ہیں۔ یہاں بھی توازن ان کا نشانِ امتیاز ہے۔ وہ عورتوں کو جھنڈا بردار بنانے کی قائل نہیں بلکہ مردوں کے قبیح رویوں کو سنجیدہ اور پر وقار لہجے میں نشان زد کر کے مثبت غور و فکر کی فضا تیار کرنے میں یقین رکھتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ طبقۂ ذکور کو برا بھلا کہنا اور کوستے رہنا آزادیِ نسواں اور تانیثیت کا ہرگز مقصد نہیں۔ مردوں اور بچوں کے بغیر زندہ رہنے کا

تصورِ خیالِ خام ہے۔ بھرپور ازدواجی زندگی کی مسرتیں ہی نسوانیت کا عین مقصد ہے۔ ایک مختصر سی نظم 'کربِ خود آ گہی' ملاحظہ کریں:

تہذیب کی شاخ پر بیٹھی ہوئی سہمی سہمی مس فاختہ!
تم سے اتنا بھی نہ ہوا
کہ کسی محفل میں
نام نہاد ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ
دو پیگ وہسکی پی کر
بہکی بہکی باتیں کرتیں
تمھارے ہم نشیں و ہم مشرب نقاد اور ادیب
انھیں فلسفے کا نام دیتے
لفظ لفظ میں معانی و مفاہیم تلاش کرتے
حرف حرف میں گہرائی و گیرائی پاتے
اور تمھارے جسم میں اترتی ہوئی
اپنی ہوس کار نگاہوں اور بے ہودگیوں کا خراج
تم پر لمبے چوڑے مقالے لکھ کر ادا کرتے
تمھاری جراتِ اظہار اور بے باکیِ گفتار کے قصیدے
پڑھتے ہوئے
گھر کی چار دیواری میں محبوس
اپنی بے وقوف بیویوں کے پاس
ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے لوٹ جاتے

اس مختصر سی نظم میں رفیعہ شبنم عابدی نے عورتوں کی تین قسموں کو بہ طورِ کردار پیش کیا ہے۔ پہلی قسم کی نمائندہ خود ان کی ذات ہے، جسے وہ تہذیب کی شاخ پر بیٹھی ہوئی سہمی سہمی مس فاختہ کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ یعنی ایسی خواتین جو علم و فن سے آراستہ ہیں اور شریکِ محفل بھی۔ لیکن تہذیبی اقدار اور اپنے وقار و ناموس کو ہمیشہ ملحوظ رکھتی ہیں۔ دوسری قسم ان عورتوں کی ہے جو بہ ظاہر تعلیم یافتہ ہیں اور روشن خیالی کے فریب میں مبتلا بھی۔ ان کے نزدیک تعلیم، روشن خیالی اور آزادیِ نسواں کا مفہوم یہ کہ وہ جو مرضی کریں۔ اس قبیل کی عورتیں اپنی تعریف اور بے جا قدر دانی کی اس طرح خواہاں ہیں کہ انھیں نہ قدروں کی پروا ہے اور نہ ہی اپنی عزت و عصمت کی۔ تیسری قسم ان خواتین کی ہے جو بیوی کی شکل میں گھروں میں محبوس ہیں۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ روشن خیالی اور آزادیِ نسواں کی آڑ میں عورتوں کا استحصال کرنے والے جو اوباش اور عیاش قسم کے ادبا اور شعرا ندکور ہوئے ہیں انھی کی بیویاں گھروں میں قید و بند کی زندگی گزار رہی ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی یہ پیغام دینا چاہتی ہیں کہ یہ اوباش مرد جو عورتوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں، دراصل خواتین کی صلاحیتوں اور آزادیوں کے حامی و معترف نہیں بلکہ جسم میں اترتی ہوئی ان کی ہوس کار نگاہیں اپنی بے ہودگیوں کا خراج اس لیے پیش کر رہی ہیں کہ جسم و جان کی ٹھنڈک کا سامان مہیا ہو سکے۔ اگر یہ واقعی آزادیِ نسواں کے حامی ہوتے تو اپنی بیویوں کو گھر کی چار دیواری میں قید نہیں رکھتے۔ سچائی تو یہ ہے کہ یہ تعریف و توصیف بھی خواتین کے استحصال کا حربہ ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی کا یہ امتیاز ہے کہ ان کا فکری رویہ اور شعری آہنگ ایسے دور میں بھی متوازن رہے جب خواتین قلم کاروں کو صدیوں کے احساسِ مظلومیت کے نتیجے میں مرد اساس معاشرے کے خلاف شعلہ بداماں آہنگ کے مواقع میسر تھے۔ انھیں ہمیشہ اس کا احساس رہا کہ جس کامیابی کے حصول میں وجود معدوم ہو جائے وہ کامیابی نہیں شکست ہے۔ پھول کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ سنگ صفت ہو کر مقابل کو لہو لہان کر دے۔ اس سے پھول کی طاقت ثابت نہیں ہوتی بلکہ پتھر نمایاں ہوتا ہے۔ پھول کی طاقت تب ثابت ہوگی کہ اپنے وجود کے اوصاف یعنی لطافت اور خوشبو کے ہتھیار سے ظلم و جبر کا قلع قمع کر دے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے معاشرتی نظام کے زخموں پر انگلیاں رکھی ہیں، معاشرے کے وجود پر سوالیہ نشان کبھی نہیں کھڑے کیے۔ رفیعہ شبنم عابدی نے اس نکتے کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ غیر ملکی تانیثی فلسفے کی معنویت ہمارے ملک میں کتنی اور کس حد تک ہے۔ تانیثیت کے فلسفے کی اہمیت یہاں بھی ہے لیکن اس کی جڑیں یہیں کی مٹی میں پیوست ہوں۔ مانگی ہوئی فکر اور اوڑھے ہوئے فلسفے کا حاصل انتشار اور خلفشار کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خصوصاً جب معاشرتی نظام اور مسائل جداگانہ ہوں۔ کائنات کے ہر وجود کی امتیازی اہمیت اور اس کے تناظر کا عرفان رفیعہ شبنم عابدی کا وہ جوہر ہے جو ان کے فکری رویے کو متوازن اور باوقار رکھتا ہے۔

□□□

Dr. Wahid Nazeer
Assistant Professor
Academy of Professional Development of Urdu Medium Teachers
Noam Chomsky Building
Jamia Millia Islamia
Jamia Nagar, New Delhi-110025

آسیہ یاسمین

رینو بہل
بحیثیت ناول نگار

اردو کی خواتین ناول نگاروں میں رینو بہل کا نام اہمیت کا حامل ہے ۔رینو بہل عصر حاضر کی ایک معروف و مقبول ادیبہ ہیں۔وہ افسانہ نگار، محقق، نقاد، مترجم کے ساتھ ناول نگار بھی ہیں۔معاصر فکشن نگار خواتین میں رینو بہل کی اپنی ایک شناخت رہی ہے۔رینو بہل اپنی بےلوث ادبی سر گرمیوں سے اردو ادب کو کسب فیض بھی پہنچا رہی ہیں۔

رینو بہل کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہے۔مصنفہ نے اپنی تخلیقی و ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا ہے،مگر جلد ہی شاعری سے رخ موڑ کر اپنا ناطہ نثر نگاری سے جوڑ لیا۔'صبا' ان کا تخلص تھا اور ان کی پہلی کہانی جنوری 1996ء کو بعنوان ''پرچھائیاں'' ہند سماچار' جالندھر' میں 'رینو صبا' کے نام سے چھپی ۔رینو بہل بحیثیت مصنف ادب کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کر چکی ہیں ۔ان کا ادبی سرمایہ کافی وسیع ہے ۔مگر وہ فکشن میں افسانے اور ناول کو خاص ترجیح دیتی ہیں ۔اب تک ان کے سات افسانوی مجموعے اور تین ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔جس کی زمانی ترتیب یہ ہے۔

پہلا: گرد میں اَٹے چہرے (2016) دوسرا: میرے ہونے میں کیا برائی ہے (2017) اور تیسرا: نجات دہندہ (2019) ہے۔یہ الگ الگ موضوعات پر مبنی ناول ہیں۔تینوں ناول خواتین ناول نگاری کے باب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔مصنفہ کا ہر ناول نئے مسائل و موضوع کا دریچہ کھولتا ہے۔افسانے کے ساتھ ناول نگاری پر بھی ان کی کافی مضبوط گرفت ہے ۔اس حوالے سے عصر حاضر کے معروف فکشن رائٹر ''شموئل احمد'' رقمطراز ہیں:

> ''رینو بہل نے اردو فکشن میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے اور اپنے گہرے سماجی شعور کے لیے جانی جاتی ہیں۔زندگی کے ادنی واقعات بھی وہ اس طرح قصے میں پروتی ہیں کہ واقعات اہم ہو جاتے ہیں اور دل کو چھو لینے والی تخلیق جنم لیتی ہے''
>
> (ناول، گرد میں اَٹے چہرے، 2016، رینو بہل، مضمون ابتداء، بادہ ساغر کہے بغیر، از شموئل احمد، ص 7)

رینو بہل ایک شگفتہ مزاج ،سنجیدہ شعور اور شائستہ طبعیت کی حامل ناول نگار ہیں۔وہ معاشرے کے ان مسائل کو موضوع بناتی ہیں جو جاذب نظر کے ساتھ پر کشش اور تحیر خیز بھی ہوتے ہیں۔''گرد میں اَٹے چہرے'' ان کی ناول نگاری کی پہلی کاوش ہے جس کی اشاعت سن 2016ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے ہوئی۔یہ ناول 335 صفحات پر مشتمل ہے۔مصنفہ نے اس ناول میں سماج و معاشرے کے ایسے روزمرہ مسائل کو موضوع بنایا ہے جن میں سماج و معاشرے کے اکثر و بیشتر لوگ ملوث ہیں ۔مصنفہ نے اس ناول میں محبت اور عزت نفس کی طرف روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے ۔ناول میں ایک ماں کی بے وفائی کے باعث پورے اہل خانہ کی تباہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔رشتے کی پائیداری، مرد و عورت کا حسین امتزاج

اور والدین کی قربت ومحبت کا باہمی اشتراک اور فطری توازن کا ہونا بے حد ضروری ہے۔اس نازک رشتے میں تھوڑی سی بھی بے توجہی اور بے راہ روی علیحدگی کی دیوار حائل کر سکتی ہے۔رشتے کی اس تشنگی اور خامی کو رینو بہل نے الفاظ کا جامہ پہنا کر ناول کی لڑی میں پرویا ہے۔یہ ناول انہی ارضی حقائق کی کھلی کتاب ہے۔فکری سطح پہ دیکھا جائے تو یہ ناول کوئی نئے یا نایاب موضوع پر مشتمل نہیں ہے،لیکن مصنفہ نے اسے اپنے گہرے فکر و شعور اور کردار کی مدد سے عصر حاضر سے ہم آہنگ اور مربوط کر دیا ہے جس سے ناول میں ایک نئی جان اور انفرادیت پیدا ہوئی۔

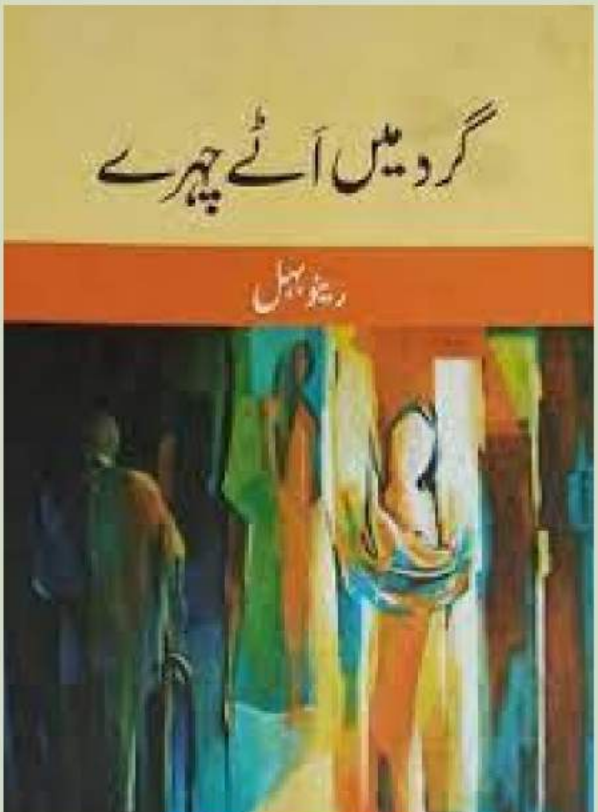

ناول کی کہانی ایک تعلیم یافتہ اور عزت دار گھرانے کے گرد طواف کرتی ہے۔اس کا مرکزی کردار 'سنینا سرین' ایک لڑکی ہے جو کہ پیشے سے ایک وکیل ہے۔اس کے والد 'گریش سرین' بھی ایک ریٹائرڈ آفیسر ہوتے ہیں۔پورا گھرانہ نہ صرف تعلیم جیسے زیور سے مالا مال ہے، بلکہ عزت و شرافت بھی ان لوگوں کی رگ رگ میں پیوست ہے جسے وہ لوگ دولت، شہرت سے زیادہ تحفظ و امان میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔مگر اس کی بے وفا ماں (شبنم) فرضی اور عارضی محبت کے دھوکے میں آکر اپنے پاک رشتے سے تعمیر کردہ اہل خانہ کی زندگی کو ہی درہم برہم کر دیتی ہے۔اس ناول سے متعلق ناول کی ابتداء میں شموئل احمد لکھتے ہیں کہ:

''رینو بہل کا ناول گرد میں اَٹے چہرے اس قول کی تفسیر ہے۔ ناول کی ہیروئن سنینا محبت کی ماری ہوئی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ اس کی سوچ بدل چکی ہے۔اس کے لیے یقین، اعتماد، بھروسہ ،وفا یہ سب فریب ہیں۔یہ ٹوٹنے کے لیے ہی بنتے ہیں،لیکن وہ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ کچھ رشتے آخری سانس تک چھوٹ کر بھی نہیں چھوٹتے چاہے نفرت کے ہوں یا محبت کے ۔پھر بھی وہ عام شکست خوردہ عورت کی طرح مرد کی جارحیت کا رونا نہیں روتی۔وہ اپنے درد کے ساتھ جیتی ہے اور دوسروں کے درد کا مداوا بھی کرتی ہے۔اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے اور معاشرے کی ستائی ہوئی عورتوں کا مقدمہ لڑتی ہے''

(گرد میں اَٹے چہرے، رینو بہل، ابتدائیہ مضمون، بادہ ساغر کہے بغیر، از شموئل احمد، 2016،ص7)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ مصنفہ نے کردار سے نہ صرف ناول کو پر کشش بنایا ہے، بلکہ ناول کو عصری تناظر سے جوڑ کر ایک نئی جان ڈالی ہے۔واقعی بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جو ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتے ہیں۔اس میں پہلا رشتہ ازدواج اور دوسرا اولاد کا رشتہ۔مصنفہ نے ان دونوں رشتوں کی اہمیت اور قدر کو ناول میں اجاگر کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔شبنم اپنے شوہر اور اولاد کے ساتھ بے وفائی کرتی ہے،لیکن اس کے باوجود گریش سرین اپنی اولاد کے مستقبل کی خاطر اپنی وکیل بیٹی کے تحت اسے باعزت بری کروا دیتے ہیں۔مگر اسے دوبارہ قبول نہیں کرتے ہیں۔کیونکہ اس نے رشتے سے زیادہ قیمتی شئے کو ٹھیس پہنچایا تھا۔ایک ضرب المثل ہے کہ ''دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا''۔ یہ مثال شبنم کے کردار پر بھی کھری ثابت ہوتی ہے۔کیونکہ ناول میں شبنم کا حال بھی یہی ہوتا ہے۔وہ معاف تو کر دی جاتی ہے،لیکن اسے دوبارہ وہ پر لطف اور اطمینان بخش زندگی نصیب نہیں ہوتی ہے۔اس ناول کے ایک سال بعد ہی مصنفہ نے ایک اور ناول اردو ادب کی خدمت میں پیش کیا۔

مصنفہ کا دوسرا ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' سن 2017 میں اشاعت پذیر ہوا۔گرچہ مصنفہ کا پہلا ناول عام روایتی مسائل سے قریب تر ہے جسے مصنفہ نے منفرد اسلوب اختیار کر کے موجودہ دور سے مربوط کیا ہے،لیکن ان کا دوسرا ناول بالکل ہی ایک منفرد نوعیت پر مبنی ناول ہے۔مصنفہ نے اس ناول کا موضوع کسی خاص ذات، طبقہ، فرقہ، مذہب اور مسلک سے نہیں بلکہ خاص نسل سے اخذ کیا ہے۔میرے علم میں شاید پہلی

دفعہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ وہ بھی ایک خاتون قلم کار کے زیر قلم۔ پہلے ناول کے مقابلے میں یہ ان کا ایک مختصر سا ناول ہے۔ جس میں مصنفہ نے اشرف المخلوقات کی ایک قسم ''خواجہ سرا'' کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس نسل سے وابستہ افراد کو سماج و معاشرے کے لوگ بد عقیدگی اور تنگ نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی خالق کائنات کی ہی تخلیق کردہ مخلوق ہے۔ مگر سماج و معاشرے کے ساتھ افراد خانہ بھی اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے دیکھنا کیا پاس رکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں نہ ہی اس کا اور نہ ہی اس کے والدین کا کوئی قصور ہے۔ یہ تو قدرت کا کرشمہ ہے اور پوری قدرت کا انحصار اور اختیار صرف اور صرف اس ذات واحد میں موجود ہے۔ وہ جسے چاہے کسی بھی روپ میں ڈھال سکتا ہے۔

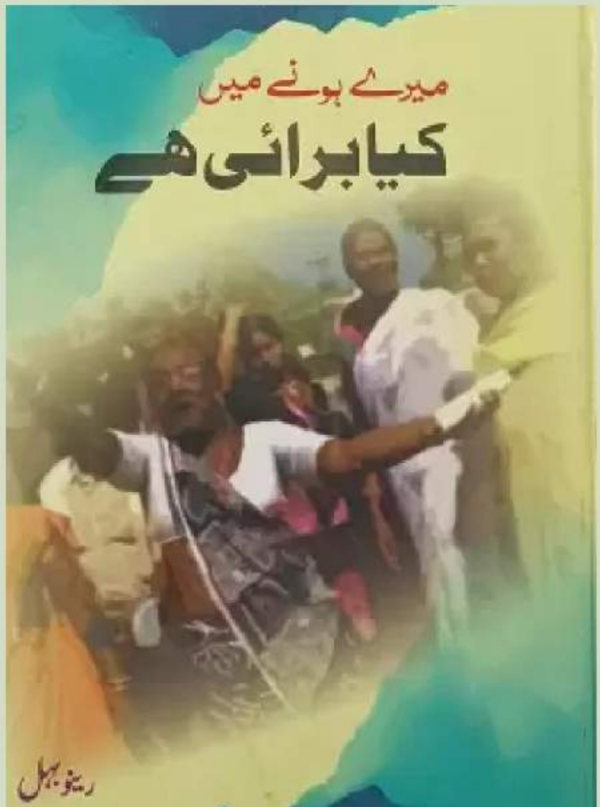

مصنفہ کے اس ناول کا عنوان ہی معاشرے کے تلخ حقائق پر مبنی ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مصنفہ نے پورے ناول میں نسل ہیجڑا (Transgender) کی روداد کو بہت ہی پر درد انداز میں پیش کیا ہے۔ پورا ناول اس نسل خاص کے حالات و کیفیات، نشست و برخاست اور طرز معاشرت سے مزین و آراستہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار شیکھر نامی ایک لڑکا ہے جو ظاہری طور پر تو مردانہ صورت کا ہے، لیکن باطنی صفت اس کی نسوانی ہے۔ اس دوہری صفت کے باعث وہ کافی تذبذب اور کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر اس نسل سے متعلق سوال قائم کرتا ہے۔ سوال ہی ناول کا عنوان ہوتا ہے اور عنوان مصنفہ کا نقطۂ نگاہ اور پورے ناول کا خلاصہ ہے۔ مرکزی کردار کی زبانی ناول کی کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہے:

> ''بیس سال تک جسے وہ گھر کا بڑا بیٹا کہتے رہے اب اسے بیٹی مان لینا ان کے لیے آسان نہیں۔ اور بیٹی بھی کیسی، آدھی آدھوری جس کا جسم تو مرد کا ہے مگر روح عورت کی''۔ یہ نا انصافی تو اوپر والے نے کی ہے۔ ہماری تو کوئی خطا نہیں۔ پھر سزا ہمیں کیوں ملے؟''

(ناول، میرے ہونے میں کیا برائی ہے، رینو بہل، 2017ء، ص 15)

دراصل مصنفہ کا یہ ناول ایک ہیجڑے کی نفسیات پر مبنی ہے۔ جس کو مصنفہ نے بہت باریکی سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں ہیجڑوں کی زندگی کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے اس ناول کے ذریعہ Transgender کے مسائل کو دور کرنے اور اس سے وابستہ کاموں سے الگ ہو کر کوئی نئی راہ ڈھونڈ نکالنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سماج و معاشرہ ہی نہیں بلکہ اس نسل سے وابستہ لوگ بھی خود کو ان کاموں تک محدود و محصور کر دیتے ہیں۔ جس کے ذمہ دار وہ خود بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ سماج و معاشرہ۔

نسل خاص کے بعد مصنفہ نے اپنے تیسرے ناول میں خاص ذات کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول مختصر مدت کے وقفے کے بعد سال 2019ء میں منظر عام پر آیا۔ جس کا عنوان ''نجات دہندہ'' ہے۔ مصنفہ نے اس ناول کا موضوع سماج کے بالکل پست طبقے سے اخذ کیا ہے۔ ناول سرزمین بنارس سے تعلق رکھنے والے دلت، آدی واسی اور ڈوم قبیلے کی ہے۔ مصنفہ کی کہانیوں کے موضوعات بیشتر حساس اور انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے والے ہوتے ہیں۔ ان ہی حساس موضوعات میں سے ایک موضوع ڈوم قبیلے کا بھی ہے۔ زیر بحث ناول کے متعلق ''اسلم جمشید پوری'' رقمطراز ہیں:۔

> ''دراصل رینو بہل نئے موضوعات پر قلم اٹھانا پسند کرتی ہیں۔ 'نجات دہندۂ بنارس کے ڈوم ذات کی اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کی کہانی ہے''

(مشمولہ، ماہنامہ اردو دنیا، مارچ 2020، اسلم جمشید پوری، 2019 کا فکشن ایک جائزہ، ص 38)

''نجات دہندہ'' بنارس کی ڈوم ذات کی تاریکی سے روشنی کی طرف بڑھتی زندگی کی کہانی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار 'دیوا کر' ہے۔ جس کا

تعلق ڈوم نسل سے ہے۔270 صفحات پر مشتمل ناول کی کہانی دیواکر اور اس کے اہل خانہ اور ڈوم ذات کے اطراف واکناف گھومتی ہے۔دراصل مصنفہ نے دیواکر کے اہل خانہ کو مرکز بنا کر ڈوم ذات کے حالات وکیفیات ،سماجی حیثیت اور طرز معاشرت کو اجاگر کیا ہے۔ناول ابتداء سے اختتام تک ذات پرستی اور اس ذات سے تعلق رکھنے والے سماجی باشندوں کے حالات وواقعات اور سماج میں درپیش مسائل اور ذات کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق ،نظریہ،خیال وغیرہ کا احاطہ کرتی ہے۔ہر ملک اور قوم میں اعلی طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں کو کمتر سمجھتے ہیں۔کیونکہ وہ اچھوت ذات سے جانے جاتے ہیں۔اس ذات کے لوگوں کو غلاظت کا ڈھیر سمجھا جاتا ہے ۔مگر مصنفہ نے انقلابی کردار پیش کر کے مفاد پرست سماج،مطلب پرست معاشرہ اور تنگ نظر افراد کو بے نقاب کیا ہے اور ان تلخ حقائق کے پیش نظر بے شعور انسان کے نظریہ کو پیش کیا ہے کہ یہ کیسا اچھوت پن ہے جسے زندہ انسان میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے مرجانے کے بعد اس کا آخری کریہ کرم اس ذات کے لوگوں سے ہی پورا کرواتے ہیں۔دیواکر کا خاندان بھی انھیں کاموں سے جانا اور پہچانا جاتا ہے مگر دیواکر خود کو اس راہ سے الگ کر کے اعلی حصول تعلیم کے لیے پنجاب کا سفر طئے کرتا ہے تاکہ خود کے ساتھ اہل ذات کے مستقبل کو بھی روشن بنا سکے۔اس مسئلہ کا کامیاب حل اس میں نظر آتا ہے کہ خود اچھوتوں سے احساس کمتری کے احساس کو کم کیا جائے اور سماج کے صحیح مقصد ومفہوم سے انھیں روشناس کرایا جائے اور ان کے لیے ترقی کی راہیں استوار کی جائیں ۔لہذا ناول کا مرکزی کردار دیواکر اس خاص رجحان کا علمبردار ہوتا ہے۔اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ذاتی فکر وکوشش سے نہ صرف اہل خانہ کو بلکہ اچھوت ذات کو روشن مستقبل کی راہ دکھائی ہے ۔اس ذات کے لوگ اپنی دنیا کو محدود کر رہے تھے ۔شمشان گھاٹوں سے کنارہ کشی کرنا نہیں چاہتے تھے۔تعلیمی میدان میں آگے نہیں بڑھتے تھے۔وہ اس وجہ سے کہ پڑھ لکھ کر بھی یہ لوگ نوکری سے محروم رہتے ہیں ۔مگر دیواکر کا کردار ایک آئیڈیل بن کر سامنے آتا ہے۔لہذا مصنفہ نے اس ذات،مسئلہ اور موضوع کے پس منظر میں تعلیم کی اہمیت وافادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ناول نگار کا اصل منشاء تعلیم ہے جس کو انھوں نے اس ذات،طبقے اور نسل سے مربوط کر کے پیش کیا ہے اور بذریعہ مرکزی کردار یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علم ایک ایسی دھار ہے جو ہر شئے کو کاٹ سکتی ہے اور انسانی ذہن کے فکری ونظری افتراقات کو بھی منہدم کر سکتی ہے۔

مصنفہ کی تحریریں چاہے وہ کسی بھی صنفی پیکر میں ڈھلی ہوں وہ حقیقی زندگی کی بامعنی کہانی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ زبان وبیان بھی بالکل سادہ،سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔وہ فکر وفن دونوں کو اس طرح شیر وشکر کر کے پیش کرتی ہیں کہ قاری کو وہ کوئی فرضی اور تخیلاتی نہیں بلکہ فطری کہانی معلوم ہوتی ہے۔

الغرض مصنفہ کے تینوں ناول انھیں ایک الگ مقام ومرتبہ عطا کرتے ہیں۔غور طلب بات یہ ہے کہ ان کے تینوں ناول منفرد موضوع سے آراستہ ہیں۔جس سے ان کے پختہ سماجی شعور اور گہرے مشاہدے کا راست اندازہ ہوتا ہے۔گرچہ مصنفہ نے ناول نگاری کے میدان میں قدرِ تاخیر سے قدم رکھا لیکن اس صنف میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیں گی۔سلسلہ وار اشاعت ان کے جہان ناول کو وسیع وبسیط بنا رہی ہے۔ سب سے اہم بات کہ ان ناولوں میں رینو بہل کا فن ناول نگاری بھی اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔رینو بہل اپنے فکر وفن کو لے کر کوتاہ نظر نہیں ہیں بلکہ وہ چہار سو پھیلے مسائل پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں۔تخلیق کار رینو بہل نے 'گرد میں اٹے چہرے'' 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' اور 'نجات دہندہ' کے حوالے سے سماج کے ان ہی مسائل کو روبرو کرانے کی کوشش کی ہے جس کی مثالیں آئے دن ہمارے سماج میں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔رینو بہل کی تحریروں کے یہی گوناگوں اشکال اور موضوعات یقیناً انھیں ایک کامیاب ناول نگار کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

□□□

Asiya Yasmin
Ph.D Resarch Scholar
Dept. of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachchi Bowli
Hyderbad-500032 (Telangana)

مسرور صغریٰ

غزل

پھول تنہا ہے باغباں تنہا
اپنی ساعت کا ہر سماں تنہا

ہم سے پوچھو رموز موت وحیات
دیکھ آئے ہیں ہم جہاں تنہا

ہم جو مہمان زندگی کے ہوئے
دشمن جاں تھا میزباں تنہا

پھر وضو کر کے تیری یادوں سے
دیں گے ہم عشق کی اذاں تنہا

عرش اعظم سے فرش ماتم تک
گونجتی ہے مری فغاں تنہا

چپ کھڑا تھا دکاں میں روٹی کی
تشنہ سائل شکستہ جاں تنہا

ہم مکیں بن کے دشت ویراں کے
خاک اڑائیں گے جان جاں تنہا

خشک آنکھوں میں تھا دھواں تنہا
جنگ خیبر کا یہ جواں تنہا

لاشہ بے کفن پہ حشر تلک
صبر ایوب نوحہ خواں تنہا

ڈھونڈتا پھر رہا تھا اشک یتیم
زیر کون و مکاں اماں تنہا

اٹھ کے قدرت سے دوستی کر لے
کیوں تڑپتا ہے نیم جاں تنہا

قلب مسرور سے لہو جاری
معجز ہ ہوگیا میاں تنہا

Dr. Masroor Soghra
Assistant Prof. (Guest Faculty)
C M College
Quilaghat, Rahamganj
Darbhanga-846004 (Bihar)

نظمیں

آبگینہ عارف

میرا ہونا کیا ہے؟

اے آسماں تجھ کو تو پتا ہوگا
اس نے مجھ سے کیا کہا ہوگا....؟
میں نے اپنی وسعتوں سے پرے
کس قدر اس کو چاہا ہوگا
ایک آبگینہ چمک رہا ہوگا
میں نے جب آسماں سے پوچھا تھا
میرا ہونا کیا ہے؟----
وہ بڑے صبر سے مسکرایا
مجھے یہ سمجھایا.....
تیرے ذہن کی آسودگی
تیرے لہجے کی خوش نمائی
تیرے دل میں ایک جہاں آباد
جہاں میں آسماں بن کے رہتا ہوں
ہر صبح سورج بن کے اُبھرتا ہوں
اور شام
تاروں سے مل کے ڈھلتا ہوں
میرا ہونا تجھ میں ہے
اور تیرے ہونے میں
میں ہوں---آب

محبت

وہ مونگرے کا پودا
روز بغیر کچھ مانگے
اپنا کھِلتا ہوا چہرہ لے کر
کچھ نہ کہہ کر
بھی
پھول دیتا ہے
میرے اعتراف میں خوشبو سی بکھر جاتی ہے
ہنستا ہر دم رہتا ہے
میں ہولے سے مسکراتی ہوں
خود کو یہ ہی سمجھاتی ہوں
یوں ہر دن
کچھ مانگے بغیر
بس دیے جانا
شاید یہ ہی
محبت ہے

Abgeena Arif
C-5 Jasola Village
New Delhi-110025
abgeena.jmi@gmail.com
9810972959

غزلیں

شازیہ نیازی

وحشت جب التجاؤں کے حصے میں آ گئی
زاری پھٹی رداؤں کے حصے میں آ گئی

اک شہر تیرے نام سے منسوب ہو گیا
تہذیب میرے گاؤں کے حصے میں آ گئی

عشق و وفا کی راہ تباہی شعار ہے
میں کس طرح بلاؤں کے حصے میں آ گئی

ناداں سپاہی جنگ میں دل ہار کر گیا
تلوار میرے پاؤں کے حصے میں آ گئی

اک بیج کی، شکم جو بنیاد پڑ گئی
دولت وفا کی ، ماؤں کے حصے میں آ گئی

کیسا جنون عشق کے دفتر میں آ گیا
سب فائلیں سمیٹ کے دل گھر میں آ گیا

اک درد بچ گیا تھا جو سہنے کے واسطے
احساس میرا راہ کے پتھر میں آ گیا

تلخی تمھاری ذات کی مشہور ہو گئی
مہندی کا رنگ چھوٹ کے چادر میں آ گیا

اس کی ہتھیلیوں سے بھی راحت نہیں ملی
یہ کس طرح کا درد مرے سر میں آ گیا

مجھ کو ملا تھا باغ میں اک بولتا گلاب
ہونٹوں سے جب لگایا تو پیکر میں آ گیا

پھر آج اک پرندہ ترا شہر چھوڑ کر
دستک دیے بغیر مرے گھر میں آ گیا

Shazia Niyazi
Alam Nagar, Burnpur
Asansol- 713325 (West Bengal)

ذمہ دار کون

نزہت نبیلہ

ہمارے گھر کے پیچھے محلے سے رونے پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''ہمارے گھر کے پیچھے ایک چھوٹا سا محلّہ تھا جہاں غریب طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ وہاں کے مرد رکشت چلاتے تھے یا مزدوری کیا کرتے تھے۔ عورتیں اور لڑکیاں گھر گھر کام کیا کرتیں، اسی محلّہ میں زلیخا بوا بھی رہا کرتی تھیں اور بوا کے گھر سے ہی رونے چیخنے کی آوازیں آرہی تھی۔

''کہیں نانی تو نہیں گزر گئیں'' میں تقریباً بھاگتے ہوئے چھت پر گئی تھی اور سامنے کھڑی لڑکی کو آواز دے کر بلایا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی تھی...... چندا کیا ہوا...... زلیخا بوا کے گھر کے رونے پیٹنے کی آواز کیوں آ رہی ہے......؟

مامی...... مامی گڑیا آپی مر گئیں......

کیا بک رہی ہو۔ میں نے اسے ڈانٹا تھا۔ سچ مامی دلی سے فون آیا تھا...... سب کہہ رہے ہیں اُس کے میاں نے اسے پیٹ پیٹ کر مار ڈالا۔

اچھا جاؤ جلدی سے اپنی اماں کو بلا لاؤ...... وہ بھاگتی ہوئی گئی تھی اور اپنی اماں کو ساتھ لے آئی تھی۔ پر اس کی اماں نے تفصیل سے بتائی تھی...... مکان مالک۔ (دوست) اس کی بیوی کا فون آیا تھا۔''

میں سکتے میں تھی۔

پندرہ دن قبل کی ہی تو بات تھی۔

جلدی، جلدی سارے کام نپٹا کر میں پردے سلنے بیٹھی تھی...... گھر کے سارے پردے بدرنگ ہو گئے تھے۔ کئی دنوں سے پردے کے کپڑے کے کپڑے لا کر پڑے ہوئے تھے...... ابھی ایک پردہ سلا بھی نہیں تھا کہ بل بجنے لگی۔ وہ بھی مسلسل...... کون ہے جو اس طرح بل بجاتا ہے چلا جا رہا ہے۔ میں بڑبڑاتی ہوئی ڈور تک گئی تھی۔ ڈور کھولنے پر ایک لاغر سی عورت بدرنگ سا سوٹ پہنے بغل میں ایک بچے کو دبائے سامنے کھڑی تھی...... ساتھ دو ڈھائی سال کی ایک بچی گندہ سا فراک پہنے ماں کا آنچل

تھامے سہمی سہمی سی کھڑی تھی۔

السلام علیکم مامی!

وعلیکم السلام......اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں اسے بغور دیکھ رہی تھی۔اس کی آواز پہچانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔

مامی آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟

اور جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو ہلکی سی چیخ میرے حلق میں دب کر رہ گئی......گڑیا تم!

میں اسے بے یقینی سے دیکھے چلی جا رہی تھی......جیسے اب بھی مجھے یقین نہ ہو کہ یہ لاغر سی عورت کوئی اور نہیں گڑیا تھی۔آؤ اندر آجاؤ......یہ کہتے ہوئے میں اسے اندر لے آئی تھی۔زرد چہرے پچکتے گال۔بے رونق سی آنکھیں پپڑی پڑے ہونٹ، جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارے خون نچوڑ لیے ہوں۔میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

کب آئی تم......؟

کل آئی ہوں اور پرسوں واپسی کا ٹکٹ ہے۔

امی دہلی گئی ہوئی تھی......نانی بیمار چل رہی ہیں امی نانی کو دیکھنے آ رہی تھیں تو امی نے مجھے زبردستی لے آئیں......نانی مجھے دیکھنے کے لیے بہت روتی تھیں۔میرا ابھی ایک بار سب سے ملنے کو دل چاہتا تھا۔

عاشی اسکول گئی ہے مامی......؟ ہاں دو بجے تک آتی ہے۔

ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ......کیا تمھارا شوہر تم پر ظلم کرتا ہے۔

تمھاری حالت دیکھ کر یہی اندازہ لگ رہا ہے میرے اس وال پر اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسوں نکل پڑے۔مامی آپ کو پتہ تو ہوگا تین بچے پہلی بیوی سے ہے اور دو ہمارے ہیں۔سارا دن کام اور بچوں کی دیکھ ریکھ میں گزر جاتا ہے۔ساتھ میں بوڑھی ساس کی تیمارداری خود کا خیال رکھنے کا موقع کہاں؟ اور میرا میاں بہت ہی بد مزاج ہے۔ہر رات نشہ کر کے آتا ہے بات بات پر مجھے اور بچوں کو پیٹتا ہے یہ سب بتاتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔جسے وہ دوپٹہ سے پوچھتی جا رہی تھی......میں سن رہی تھی اور خالی خالی ذہن سے اسے دیکھ رہی تھی۔وہ اس بات بات پر قہقہہ لگانا وہ سب کہاں کھو گیا تھا آج تو اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تک نہیں تھی۔گود والا بچہ جاگ گیا تھا اور رو رہا تھا......مامی چلتی ہوں پھر آؤں گی عاشی کو دیکھنے؟ اچھا تھوڑی دیر رکو، میں اسے بیٹھا کر کچن میں آئی تھی......اتفاق سے آج میں نے بریانی شامی کباب اور ساتھ ہی رائتہ بنایا تھا۔وہ کھانے کو تیار نہیں تھی......لیکن میرے اصرار پر وہ انکار نہیں کر سکی۔میں اسے اور اس کی بچوں کو کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"میرے میاں نے میرے ابا اور چچا کو اپنے دوست کا گھر دکھا کر کہا تھا کہ اس کا خود کا گھر ہے اس کا دوست اپنی فیملی کے ساتھ گاؤں گیا ہوا تھا۔

اسی گھر میں وہ کمرہ کرایے پر لے رکھے ہیں۔وہ کھانے کے دوران بتا رہی تھی۔پہلے گھر سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے......صبح کلام پاک پڑھنے مسجد جاتا ہے۔سامنے ہی مدرسہ ہے وہاں نام لکھوا دیا ہے۔تاکید سے بھیجتی ہوں۔باپ کو ان سب کا کہاں خیال......تین بجے سے چھ بجے تک ایک گیرج میں کام کرتا ہے۔جو پیسہ ملتا ہے میرے ہاتھ میں لا کر دے دیتا ہے۔جس سے گھر کا تھوڑا بہت خرچہ چل جاتا ہے۔

میں بھی اا اپنے بچوں جیسا ہی ان بچوں کو پیار دیتی ہوں۔

میرے میاں کو تو شراب اور جوئے سے فرصت کہاں......کبھی کبھی راشن پانی لا دیتا ہے۔جب کہ آٹو رکشہ میں اچھا پیسہ کما لیتا ہے۔لیکن سارا پیسہ جوا اور شراب میں اڑا دیتا ہے......جواری، شرابی اور ظالم انسان ہے جس نے میرے جسم کا سارے خون چوس لیا۔میرے ساتھ بچوں کو بھی بے دردی سے پیٹتا ہے......ان معصوم بچوں کی خاطر زندہ ہوں مامی......ورنہ اتنے ظلم سہ کر زندہ رہنا پسند نہیں کرتی۔

میرے ماں باپ نے میری زندگی برباد کر دی ہو ایک بار پھر سسک پڑی تھی۔کل کی بچی آج اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی اس کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے......وہ جانے لگی تو میں نے دو تین سوٹ، پانچ سو روپے اور اس کی بیٹی کے لیے چھوٹے چھوٹے فراک (عاشی کے کچھ چھوٹے چھوٹے اچھے اچھے فراک رکھے ہوئے تھے) بسکٹ، ٹافیاں بڑے سے شاپر میں کر کے اسے تھما دیے تھے۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھی۔پتہ نہیں یہ تشکر کے آنسو تھے یا پھر......؟ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی، ورنہ وہ تو آہستہ چلنا جانتی ہی نہیں تھی۔میں جاتے ہوئے بس دیکھتی ہی رہی۔

روشن خالہ کے جوڑوں میں تکلیف رہنے لگی تھی تو انھوں نے اپنی جگہ زلیخا بوا کو کام پر رکھوا دیا تھا جو ہمارے گھر کے پچھواڑے محلے میں رہتی تھی۔وہ صبح برتن جھاڑو کر کے چلی جاتی اور دس بجے تک اپنی بیٹی گڑیا کو بھیج دیتی گڑیا تیرہ چودہ سال کی تھی۔(وہ صبح استانی سے کلام پاک پڑھنے جایا کرتی تھی۔) وہ آیا کرتی تھی ناشتے کے برتن دھونے اور پوچھا کرنے لیکن سارا دن عاشی کے ساتھ کھیل میں گزار دیتی۔اس کی ساری ذمہ داری اس

نے اپنے سر لے لی تھی۔ اسے نہلاتی...... تیار کرتی اور اس کے ساتھ دوڑتی بھاگتی رہتی اور ساتھ ساتھ میرے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا دیا کرتی۔ خوب باتیں کرتی اور کھلے دل سے قہقہہ لگاتی اس نے بتایا تھا کہ ایک سال قبل وہ لوگ ابا کے ساتھ سہارنپور میں رہا کرتی تھی...... اور ابا اور بھائی کتا کی بائنڈنگ کا کام کیا کرتے ہیں۔ ماما کی شادی میں ہم لوگ مونگیر نانی کے گھر آئے تھے ماما کی شادی کے بعد ابا اور بھائی واپس چلے گئے اور ہم لوگ نانی کے گھر رک گئے۔

ہم تین بھائی اور دو بہنیں ہیں ایک بھائی ہم سے بڑا ہے۔ اور باقی سے چھوٹے...... کام کرتے کرتے وہ یہ سب بتایا کرتی۔

اس کی وجہ سے میرا گھر بالکل گلزار بن گیا تھا۔ میں جہاں جاتی اسے ساتھ لے جاتی۔ چاہے وہ شوپنگ ہو یا کوئی فنکشن پارٹی۔

اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ فرصت کے دوران اسے پڑھا بھی دیتی۔ رمضان میں وہ روزے بھی رکھتی میرے ساتھ نماز بھی پڑھتی۔ افطار بنانے اور لگانے میں میری مدد بھی کرتی۔

”عید کے دن جب وہ تیار ہو کر آتی تو اس پر سے نگاہ نہیں ہٹتی۔ اتنی پیاری سی لگتی وہ عید کا سارا دن وہ آس پڑوس گھومنے میں گزار دیتی۔ ایک دو جگہ زبردستی عاشی کو بھی لے جاتی اور اسے غبارے وغیرہ دلا دیتی۔ دو سالوں میں وہ ہمارے گھر کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ اگر میں اور عاشی دو چار دنوں کے لیے شہر سے باہر چلے جاتے تو وہ پریشان ہو جاتی وہ بھی ہم لوگوں کے بغیر نہیں رہ پاتی تھی۔“

عید کی شاپنگ پر وہ ہمارے ساتھ مارکیٹ جاتی میں اس کی پسند سے اس کے کپڑے خریدتی ساتھ میں میچنگ چوڑیاں، میچنگ جولیری، سینڈل، مہندی، نیل پالش وغیرہ وغیرہ...... یہ سب خریدنے پر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا...... ساری چیزیں محلے بھر میں دکھائی کرتی۔ چاند نکلنے سے پہلے ہی وہ عاشی کو مہندی لگا دیتی اور اسے بہلا پھسلا کر رکھتی تا کہ مہندی خراب نہ کر لے مجھے بھی مہندی لگانے کے لیے بضد ہو جاتی۔ لیکن مجھے اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی کہ مہندی لگا کر دو گھنٹہ بیٹھ جاتی۔

چاند نکلتے ہی میرے ساتھ پردے کشن میں لگانے میں مدد کرتی...... اور کچھ ڈشیں بھی تیار کرنے میں ہاتھ بٹا دیتی...... اور گھر جا کر ساری رات جاگ کر اپنے محلے کی لڑکیوں کو مہندی لگاتی اور آخر میں خود کو۔

عید کے دن جب وہ تیار ہو کر آتی تو اس پر سے نگاہ نہیں ہٹتی۔ اتنی پیاری سی لگتی وہ عید کا سارا دن وہ آس پڑوس گھومنے میں گزار دیتی۔ ایک دو جگہ زبردستی عاشی کو بھی لے جاتی اور اسے غبارے وغیرہ دلا دیتی۔ دو سالوں میں وہ ہمارے گھر کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ اگر میں اور عاشی دو چار دنوں کے لیے شہر سے باہر چلے جاتے تو وہ پریشان ہو جاتی وہ بھی ہم لوگوں کے بغیر نہیں رہ پاتی تھی۔

عاشی اسکول جاتی تو وہ عاشی کو تیار کرتی اس کا ٹفن پیک کرتی اور اسے اسکول وین تک چھوڑنے جاتی۔ ہر روز ایک ہی سوال مامی عاشی کب آئے گی؟ اس کے انتظار میں ادھر ادھر چکر لگاتی اور عاشی کے آتے ہی خوش ہو جاتی۔

ان دنوں زلیخا بوا کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی تھی اور جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے کہا تھا ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ اس کی شادی کے لیے پریشان ہو رہی ہو۔

سولہ سال کی ہو رہی ہے اور ہمارے پریوار میں اس عمر میں لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں۔

تمہیں معلوم نہیں” قانوناً 18 سال سے پہلے لڑکی کی شادی کرنا جرم ہے اگر کسی نے پولیس میں خبر کر دی تو پولیس تمہیں گرفتار کر سکتی ہے اور تمہیں سزا بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے ڈرایا۔ مجھے قانون نہ سکھائیں ہمارے پریوار میں جو ہوتا چلا آ رہا ہے۔ وہی ہم کریں گے۔ وہ بڑبڑائی ہوئی چلی گئی تھی۔

دو دن سے گڑیا نہیں آ رہی تھی۔ عاشی کے ساتھ میں بھی پریشان تھی اور خود زلیخا بوا بھی نہیں آ رہی تھی...... میں نے سارے گھر کی ایک لڑکی سے خبر بھجوائی تھی...... زلیخا بوا کے آنے پر میں نے پوچھا نہ تم آ رہا ہو نہ گڑیا آ رہی ہے...... آخر بات کیا ہے۔ عاشی کتنا تنگ کر رہی ہے وہ گڑیا کے بغیر رہتی نہیں۔

ابھی ہم کو دم مارنے کا فرصت نہیں...... اور گڑیا کو پردے میں بیٹھا دیا تھا۔ پردے میں بیٹھا دیا ہے کیوں بھلا؟ میں نے پوچھا تھا۔

کل اس کی ہلدی ہے...... اور اتوار کو اس کا نکاح ہے...... کہ...... کیا۔ گڑیا کا نکاح کس سے اور کہاں؟ کون؟ کیا کرتا ہے؟ بہت

سارے سوال ایک ساتھ کر ڈالے میں نے۔

لڑکا دلی میں رہتا ہے اپنا مکان ہے۔ اپنا آٹو رکشہ ہے۔ اچھا کماتا ہے۔ بیوی مرگئی ہے۔ تین بچے ہیں ایک پیسہ مانگ نہیں...... دوہرے خرچ سے شادی کررہا ہے۔ گڑیا کے ابا اور چچا نے لڑکے کو جا کر دیکھ لیا ہے...... اور پتہ لگالیا ہے۔

کیا کہہ رہی ہو تم اپنی پھول سی بچی کا نکاح ایسے انسان سے کردوگی جس کی پہلی بیوی مرچکی ہے اور جو تین بچے کا باپ ہے تم کیسی ماں ہو ایک عمر رسیدہ انسان سے نکاح کے ساتھ ساتھ تین بچوں کی ماں بننے پر مجبور کر دوگی۔ تمھیں اس کی معصومیت پر ترس نہیں آرہا...... کیا تم اپنی معصوم بچی پر ظلم نہیں کررہی ہو؟ تمھیں معلوم ہونا چاہیے ٹیکسی اور آٹو چلانے والے نشہ بھی کرتے ہیں۔

لڑکا بہت شریف ہے گڑیا کے ابا اور چچا نے سب کچھ پتہ کرلیا ہے۔

آخر اتنی جلد بازی کیوں کررہی ہو شادی میں اچھے رشتے مل جائیں گے ابھی وہ بچی ہے۔ میں اس کی شادی اپنی جگہ کرواؤں گی اس کی شادی کا ذمہ

"آخر اتنی جلد بازی کیوں کر رہی ہو شادی میں اچھے رشتے مل جائیں گے ابھی وہ بچی ہے۔ میں اس کی شادی اپنی جگہ کرواؤں گی اس کی شادی کا ذمہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ لیکن سہی وقت پر...... جانے اس پر جنون سوار ہو گیا تھا۔"

تم مجھ پر چھوڑ دو۔ لیکن سہی وقت پر...... جانے اس پر جنون سوار ہو گیا تھا۔

ارے رہنے دیں کہنے میں کیا جاتا ہے۔ بہت دنیا چیکھ چکے ہیں کون کسی غریب لڑکی کو شادی کرواتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ دندناتی ہوئی چلی گئی تھی...... اور میں آواز دیتی رہ گئی تھی...... زلیخا بوا میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا یقین کرو...... کاش میں اس نکاح کو روک سکتی!

ایک دن قبل لڑکے کو لے کر گڑیا کے ابا چچا اور بھائی آگئے تھے......

اور اتوار کے دن گڑیا کا نکاح ہو گیا تھا۔

اور دوسرے دن مرکم شلا سے دہلی چلی گئی تھی...... جانے سے قبل وہ مجھ سے ملنے آئی تھی، مجھ سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی تھی...... میں اشکبار آنکھوں سے اسے گیٹ تک چھوڑنے گئی تھی گلی کے باہر آٹو رکشہ کھڑا تھا زلیخا بوا کا خاندان اور محلے کی ساری عورتیں اور لڑکیاں بھیڑ لگائے ہوئے تھیں۔ کرتا پائجامہ پہنے دولہا کھڑا تھا لگ بھگ 45-44 سال کا ہوگا۔ آٹو رکشہ پر چڑھتے ہوئے مجھے گڑیا بار بار مجھے دیکھ رہی تھی! گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور میں خلا میں دیکھتی رہی تھی!

کئی دنوں تک میں اپ سٹ رہی تھی! عاشی بھی گڑیا کو یاد کرکے بہت روتی تھی...... وہ گڑیا کی اس طرح عادی ہوگئی تھی کہ وہ روتے روتے بیمار ہوگئی...... اور تب ہفتے بھر کے لیے میں اسے لے کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔ وہ جب بہل گئی تو میں لوٹی تھی اور ساتھ ہی ایک چھوٹی لڑکی کو لے آئی تھی۔ جس کے ساتھ عاشی کھیل کود میں بہل تو ضرور گئی تھی۔ لیکن ایک دو بار گڑیا کے بارے میں ضرور پوچھتی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں، ہم لوگ شہر سے باہر گھومنے گئے واپس آنے پر پتہ چلا زلیخا بوا بچوں سمیت اپنے شوہر کے ساتھ سہارنپور چلی گئیں۔

کتنے سارے دن لگ گئے تھے گڑیا کو بھولنے میں گھر کے ہر کونے میں اس کی یاد بسی تھی۔ اس کے قہقہے کانوں میں گونجتے ہوئے محسوس ہوتے ہر چھوٹے چھوٹے کاموں میں عاشی کو اسکول کے لیے تیار کرنے میں، کہیں فنکشن پارٹی میں جانے پر، عید کی شاپنگ پر چاند پر نہیں چاہتے ہوئے اس کی یاد آجاتی۔

اور ابھی پندرہ دن قبل اسے جس شکستہ حالت میں دیکھا تھا...... کافی افسردہ ہوگئی تھی......

اور آج اس ہولناک حادثے کی خبر سن کر میں سکتے میں تھی۔

میں چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی لیکن میری چیخ حلق میں دب کر رہ گئی تھی۔

زلیخا بوا، ان کا بھائی اور گڑیا کے بھائی، بہن روتے دھوتے دہلی جا رہے تھے لیکن اب جانے سے کیا حاصل۔ جس دن اپنی معصوم بچی کو ادھیڑ عمر سے بیاہ دیا تھا۔ اس دن ہی اس کی خوشیوں کا جنازہ نکل گیا تھا اور پلٹ کر دیکھا نہیں کہ وہ معصوم بچی کس حال میں ہے۔ کتنا درندہ اور ظالم انسان تھا وہ۔ پھول سی بچی پر کتنے ظلم ڈھائے۔ اس ظالم انسان نے کتنی بیدردی سے اسے پیٹا ہوگا۔ کتنی تڑپی ہوگی وہ کیسی بے بسی سے اس کی ہوئی ہوگی موت!

میرا رواں رواں چیخ چیخ کر یہ سوال کررہا ہے

کون ہے اس کی موت کا ذمہ دار!!؟؟

□□□

Nuzhat Nabila

Ahmad Villa, Masjid Road

Purab Sarai

Munger-811201 (Bihar)

ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک

روشنی کے سائے

انٹرویو دے کر نرگس گھر لوٹی تو ماں باورچی خانے سے پکارا---
''نممو! کپڑے بدل لے اور ہاتھ منہ دھو کر جلدی سے چلی آ۔ میں کب سے بیٹھی تیری راہ دیکھ رہی ہوں'' ماں کی آواز میں تھکاوٹ تھی۔ وہ جلدی سے چلی آئی تھی۔ جانتی تھی وہ تو صبح ہی گھر سے نکل گئی تھی آج ماں نے سب کام اکیلے ہی کیا ہے ہفتے میں ایک بار تو وہ ضرور ہی کسی نہ کسی انٹرویو کے لیے گھر سے نکلتی تھی پہلے پہلے وہ بڑی امید اور بے صبری کے ساتھ لیٹر کا انتظار کرتی تھی۔ لیکن اب دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں اداسی کی پرتیں بچھتی جا رہی تھیں اور ناامیدی ایک زخم بن کر اس کے دل میں رہنے لگی تھی لیکن وہ حتی الامکان اسے چھپانے کی کوشش کرتی تھی جانتی تھی ماں اسے اداس دیکھ کر اور زیادہ دکھی ہو جائیں گی ماں کی گرتی صحت بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھی۔

ماں بھی شروع میں بڑی آس لے کر اس سے پوچھتی تھی، ''کیسا ہوا انٹرویو؟''

اور وہ بھی بڑے چہکتے لہجے میں ماں کو ڈیٹیل سے بتاتی تھی۔ اس کی آواز میں خود اعتمادی کی کھنک ہوتی تھی آنکھوں میں جھلملاتے معصوم خواب لیکن اب تو عرصے سے ایک ان کہی خاموشی دونوں کے اندر کسی کھائی کی طرح پھیل چکی تھی ایک ان کہا، ان بولا سانجھا درد جسے دونوں محسوس کرتی تھیں لیکن کچھ کہنے کی ہمت نا اس میں تھی اور نا ماں کچھ پوچھ کر اسے مزید آزردہ کرنا چاہتی تھیں ماں کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ ان کے رہتے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جا۔

''اماں! گھٹنوں کا درد بڑھا تو نہیں'' نممو نے بوجھل خاموشی کو

توڑنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

ماں نے اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لا کر، گھٹنوں میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتے ہوئے کہا۔

''نا آج تو میں اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہی ہوں تو میری اتنی فکر کیوں کرتی ہے۔ بیٹی!''

نمو کا جی چاہتا تھا کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے ماں کا علاج کرائے انھیں بھرپور آرام کا موقع دے لیکن چاہتے ہوئے بھی وہ یہ سب کچھ کر نہیں پاتی تھی۔ گھر پر بچوں کو ٹیوشن دے کر جو کچھ ملتا، اسی میں سب خرچے پورے کرنے ہوتے تھے محلہ بھی اوسط درجے کے لوگوں کا تھا، اس لیے ٹیوشن فیس بھی کم تھی رات کو چارپائی پر پڑے پڑے سوچا کرتی کیسے نوکری ملے؟ نا کوئی سفارش نا کوئی جان پہچان پڑھائی پوری کرنے سے پہلے اس کا من بڑے مہکتے، رنگین سپنے دیکھتا تھا اسکالرشپ کے سہارے اس نے اپنی پڑھائی پوری کی تھی۔

بی۔ ایڈ کرنے کے لیے ماں کی دو سونے کی چوڑیاں اور گلے کا اکلوتا ہار بھی بک گیا تھا بی۔ ایڈ کر کے بھی وہ ایک عدد نوکری کی تلاش میں بھٹک رہی تھی ادھر ماں کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ کیسے بیٹی کے ہاتھ پیلے کرے؟ اب وہ اٹھائیس پار کر چکی تھی ادھر نمو چاہتی تھی کہ ماں سنگنی بن کر ان کے سارے دکھ دور کر دے۔

وہ جانتی تھی کہ ماں کو زندگی میں دکھ ہی دکھ ملا ہے قسمت کی ستم ظریفی کہ اپنی خاندانی روایتوں کو بھلا کر اپنی پسند کی شادی کر کے وہ اس چھوٹے سے شہر میں نسیم کے سنگ چلی آئی تھیں لیکن سکھ لکھنے والے نے لکھا ہی نہیں تھا ابھی شادی کو سات سال ہی لگا تھا کہ برین ہیمبرج میں شوہر اللہ کو پیارے ہو گئے جب تک زندہ رہے ان کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں شادی کے چھ سال بعد ایک پھول سی بچی نے جنم لیا تو ماں باپ دونوں نہال ہو گئے نسیم کی نوکری اگرچہ بہت آمدنی والی نہیں تھیں لیکن رخسانہ بیگم سمجھداری سے گھر چلاتی تھیں۔ ماں تو تھیں نہیں باپ نے دوسری شادی کر لی تھی سوتیلی ماں نے اتنے کان بھرے کہ باپ نے کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا۔

شوہر کے انتقال کے بعد تو یکایک جیسے کسی نے انھیں ویران ریگستان میں پٹک دیا تھا، جہاں دور دور تک صرف جلتی ہوئی ریت پھیلی ہوئی تھی کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ دور دور تک کوئی سایہ دینے والا پیڑ تک نہیں تھا۔ تین مہینے تو غم سے اتنی نڈھال ہو گئیں کہ اگر چھوٹی بچی کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ پاگل ہو جاتیں۔ لیکن نرگس کی بھولی بھالی باتیں اور ہنسی تھوڑی دیر کے لیے ان کا غم بھلا دیتی تھی کہتے ہیں کہ وقت بہت بڑا جرح ہے اس کے ہاتھوں کا مرہم آہستہ آہستہ گہرے سے گہرے زخم کو بھر دیتا ہے اور پھر زندگی زندگی ہے جینی ہی پڑتی ہے اپنی بچی کو اب انھیں ماں کا پیار بھی دینا تھا اور باپ کی کمی بھی پوری کرنی تھی بچے کو پڑھا کر جیسے تیسے زندگی کی گاڑی دھکیلنے لگیں وقت کے سمندر میں بہتی ناؤ ہچکولے لیتی رہی لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری اپنی لاڈلی کو لکھایا پڑھایا بٹیا بھی بلا کی ذہین چھوٹی عمر میں ہی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ماں بڑی جدوجہد کر کے اسے پڑھا رہی ہے اسے بھی ماں سے عشق تھا اگر ماں گھر سے باہر جاتی اور لوٹنے میں دیر ہوتی تو اس کا دل بری طرح گھبرانے لگتا، عجیب وغریب وسوسے دل میں آتے، کبھی کبھی رونے لگتی تھی ـــــ اور وہ دن بھی آیا جب اس نے پی ایچ ڈی کر لی ماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا ویسے ماں کے ساتھ ٹیوشن دینا تو اس نے انٹر کے بعد ہی شروع کر دیا تھا لیکن ماں اسے اونچے عہدے پر دیکھنا چاہتی تھیں۔

''کئی دن ایک ساتھ گزر گئے — ایک دن وہ انٹرویو دینے ایک کالج میں گئی تو وہاں کے پرنسپل نے اس کی ڈگریاں دیکھ کر کہا، ''اتنی قابلیت ہونے کے باوجود آپ کو کسی نے نوکری کیوں نہیں دی؟

اس نے ایک نظر اٹھا کر پرنسپل کو دیکھا — عام طور پر پرنسپل زیادہ عمر کے ہوتے ہیں — یہ ایک کم عمر سنجیدہ، سوبر سا انسان تھا — اس کے چہرے پر پروقار چمک تھی — آج تک اس طرح کا سوال کسی نے نہیں کیا تھا — پچھلے دنوں ماں کی بیماری بڑھ جانے کی وجہ سے وہ اندر سے بہت ٹوٹی ہوئی تھی — اس لیے خلاف توقع وہ غصہ سے بھر اٹھی —۔''

کئی دن ایک ساتھ گزر گئے ایک دن وہ انٹرویو دینے ایک کالج میں گئی تو وہاں کے پرنسپل نے اس کی ڈگریاں دیکھ کر کہا، ''اتنی قابلیت ہونے کے باوجود آپ کو کسی نے نوکری کیوں نہیں دی؟

اس نے ایک نظر اٹھا کر پرنسپل کو دیکھا عام طور پر پرنسپل زیادہ

عمر کے ہوتے ہیں۔یہ ایک کم عمر سنجیدہ، سوبرسا انسان تھا اس کے چہرے پر پروقار چمک تھی آج تک اس طرح کا سوال کسی نے نہیں کیا تھا پچھلے دنوں ماں کی بیماری بڑھ جانے کی وجہ سے وہ اندر سے بہت ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے خلاف توقع وہ غصہ سے بھر اٹھی۔

نوکری کیوں نہیں دی؟ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ میرے زخموں کو کرید رہے ہیں آپ لوگوں کو رشوت چاہیے قابلیت کون دیکھتا ہے؟ نوکری انھیں ملتی ہے جو مٹھی گرم کر سکتے ہیں مجھ سے لاکھوں کی تعداد میں رشوت مانگی جاتی ہے کہاں سے جٹاؤں؟ آپ کو کیا معلوم زندگی کیا ہوتی ہے؟ ماں کی دوادارو اور گھر کے دوسرے خرچ مہلت ہی نہیں دیتے کہ کچھ جمع کر سکوں تعلیم حاصل کی تھی، کچھ بننے کے لیے، کچھ کرنے کے لیے اپنی، وقت سے پہلے بوڑھی ہوتی جارہی ماں کو سہارا دینے کے لیے۔اسے حج پر لے جانے کے لیے، اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے مجھ سے کبھی نہیں کیا، لیکن میں تو بیٹی ہوں نا، اس کی ہر خواہش جان جاتی ہوں۔۔۔ اچانک اسے خیال آیا، یہ وہ کیا کہہ بیٹھی ہے؟ اب اسے گیٹ آؤٹ سننے کو ملے گا لیکن یہ کیا؟ وہ حیرت میں ڈوب گئی۔

وہ پانی کا گلاس لیے اس کے پاس کھڑا تھا پہلے ٹھنڈا پانی پی کر ٹھنڈی ہو جائیں، پھر ہم بات کرتے ہیں اس نے کہنا ماننے والے بچے کی طرح گلاس اٹھالیا اسے شرمندگی ہو رہی تھی ناحق اس نے اتنا سب کچھ کہہ ڈالا پرنسپل کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی مسکراہٹ دیکھ کر اسے پھر طیش آگیا ''میرے دکھوں کا مذاق اڑانے کے سوا آپ جیسے پتھر دل لوگ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟''

''لایئے میری فائل'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں میں معافی چاہتا ہوں''

''پلیز بیٹھ جائیں وہ سوال میں نے آپ کو دکھ پہنچانے کے لیے نہیں پوچھا تھا بلکہ آپ کی قابلیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ مجھے اپنے کالج میں آپ لوگوں کی ضرورت ہے کل سے آپ جوائن کر سکتی ہیں'' اس کے چہرے پر متانت تھی اور اپنے پن کا تاثر!

نرگس کی آنکھیں چھلچھلا اٹھیں '' آپ مجھے بنا رشوت کے نوکری کیوں دے رہے ہیں؟ کیا آپ مجھ سے کچھ اور چاہتے ہیں؟''

''ایمانداری اور لگن سے کام کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''سچ! میں ایک کالج میں گئی تو جانتے ہیں وہاں کے پرنسپل نے کیا کہا؟''

''کوئی رشوت نہیں، بس کبھی کبھی آپ کو ہمارا دل بہلانا ہوگا'' میں پیر پٹختی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی یہی ڈر میرے اندر سمایا ہوا ہے۔

> **''اچانک گھر میں خوشیاں جاگ اٹھی تھیں — ماں کا علاج، ان کے کھانے پینے کا دھیان — اس نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک نوکرانی بھی رکھ لی تھی — ایک سال گزر گیا — اب ماں کو فکر ہوئی کہ نرگس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں — اس کے کئی رشتے بھی آ چکے تھے لیکن وہ برابر ٹال رہی تھی۔''**

ڈاکٹر ماجد کے چہرے پر دکھ صاف جھلک رہا تھا '' آپ کو یہاں صاف ستھرا ماحول ملے گا آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جو ٹھوکریں آپ نے کھائی ہیں، ان سے میں بھی گزرا ہوں اس لیے آپ کی تکلیف سمجھ سکتا ہوں۔''

ماجد نے لیٹر ٹائپ کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیا لیٹر پڑھنے کے بعد اس کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ نکلی۔

'' مجھے امید ہے یہاں آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی اگر کوئی شکایت ہو تو میرے پاس چلی آیئے گا کسی سے کچھ نہیں کہیے گا۔

نرگس اٹھ کھڑی ہوئی اور دھیرے سے بولی '' معاف کیجئے گا، میں کچھ زیادہ ہی بول گئی آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے الفاظ چھوٹے معلوم ہو رہے ہیں''

''اللہ کا شکر ادا کریں''

'' گھر آئی تو ماں نماز پڑھنے کے لیے جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھیں ایک دم وہ ان کے گلے میں باہیں ڈال کر رو پڑی اماں مجھے نوکری مل گئی یہ دیکھو لیٹر، ماں یہ تمھاری دعاؤں کا پھل ہے ماں کی آنکھیں بھر آئیں اور انھوں نے بیٹی کو بوسہ دے کر کہا '' ایمانداری سے کام کرنا''

اچانک گھر میں خوشیاں جاگ اٹھی تھیں ماں کا علاج، ان کے کھانے پینے کا دھیان اس نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک نوکرانی بھی رکھ لی تھی ایک سال گزر گیا اب ماں کو فکر ہوئی کہ نرگس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اس کے کئی رشتے بھی آ چکے تھے لیکن وہ برابر ٹال رہی تھی۔

کالج میں صرف نوکری ہی نہیں ملی تھی بلکہ ماجد کے روپ میں ایک اچھا دوست بھی مل گیا تھا ایک مخلص انسان ---اور ایک انوکھی خوشی سے اس کا دل مہک اٹھا تھا ایک انوکھا جذبہ اس کے دل میں جنم لے چکا تھا جس سے وہ انجان تھی اسے یاد ہے کہ جب پہلی بار ماجد نے اسے اپنے آفس میں بلایا تو وہ کچھ سہم سی گئی تھی۔لیکن اس کے چہرے کی متانت اور سنجیدگی نے اسے مطمئن کر دیا اپنے کالج کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔وہ اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیتی رہی، کچھ مشورے بھی دیے جو ماجد کو پسند آئے۔ اس طرح بار۔باران کی ملاقات ہوتی رہی کبھی۔کبھی وہ اچانک نظر اٹھاتی تو ماجد کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پاتی وہ گھبرا کر نظریں جھکا لیتی ان نگاہوں میں بےلوث پن ہوتا تھا۔کہتے ہیں عشق اور مشق چھپائے نہیں چھپتے کچھ ٹیچروں کی نگاہوں میں یہ دوستی کانٹے کی طرح چبھنے لگی تھی ایک آدھ فقرہ بھی اچھال دیا جاتا تھا۔لیکن وہ سن کر بھی ان سنا کر دیتی تھی اب اکثر ماجد اسے اپنی گاڑی میں اسے چھوڑ دیتا تھا۔محبت کیسی حسین شے ہے یہ اس نے ماجد کے ساتھ رہ کر ہی جانا تھا ایک انجانی خوشی سے اس کا دل پہلی بار آشنا ہوا تھا اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی تھی، کیسے یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔

ایک دن ماجد نے اس سے کہا---''نرگس آپ میرے دل کے بہت قریب آچکی ہیں میں آپ کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا لیکن ایک بات میں آپ سے چھپانا نہیں چاہتا میرے ماں باپ گاؤں میں رہتے ہیں ہمارے یہاں کم عمر میں شادی کا رواج ہے کافی کم عمر میں انھوں نے میری شادی گاؤں کی ایک کم عمر لڑکی سے کر دی تھی میرے اور اس کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا میں نے نباہ کی کافی کوشش کی لیکن وہ مجھے چھوڑ کر میکے چلی گئی پھر طلاق لے کر دوسرا بیاہ رچا لیا یہ سب میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ کل کو آپ کو کچھ پتا لگے تو آپ کا بھروسہ میرے اوپر سے ہٹ جائے گا آپ سوچیں گی کہ میں نے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔

آپ کا ماضی کیا تھا اس میں میری کوئی دلچسپی نہیں میرے لیے حال اہم ہے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ میری روح میں بس چکے ہیں کیا اتنا کافی نہیں؟

ماجد نے بہت احترام بھری نظروں سے نرگس کو دیکھا ''مجھے خوشی ہے کہ میں نے صحیح جیون ساتھ کا انتخاب کیا ہے''

ایک دن نرگس نے ماں سے کہا ماجد اور میں ایک دوسرے کو دل کی گہرائی سے چاہتے ہیں مجھے امید ہے آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

''''کیا تو ماجد سے شادی کرے گی؟'' ماں نے ہکا بکا ہو کر بیٹی کو دیکھا۔

''کیوں؟ اس میں کیا برائی ہے؟''

''تو نے ہی تو بتایا تھا کہ وہ دھنیا ہے روئی دھنے والے چھوٹی ذات کے ہوتے ہیں''

''اماں! تمھیں تو کہتی ہو۔انسان انسان سب برابر ہیں پھر تمھارے خیال میں اونچ نیچ کی بات کہاں سے آگئی۔؟''

''اسلام میں اونچ نیچ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اسلام میں اعمال کے حساب سے درجہ طے ہوتا ہے امیری، غریبی یا ذات پات کے حساب سے نہیں اللہ کی نگاہ میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ کوئی بڑا''

''اور تو نے بتایا تھا کہ اس نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے'' ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

''اس نے خود ہی طلاق مانگی ماجد ایک سلجھا ہوا انسان ہے اس نے طلاق دے دی اگر تم چاہتی ہو کہ میں ماجد سے شادی نہ کروں تو ٹھیک ہے پھر تم میرے اوپر شادی کے لیے زور نہ ڈالنا ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں مجھے یقین ہے کہ دوستی پر آپ خفا نہیں ہوں گی اور شادی کے لیے مجھ پر دباؤ نہیں ڈالیں گی'' نرگس نے کہا۔

''یہ کیسی بچکانی باتیں کر رہی ہے تو؟ پاگل ہوئی ہے کیا؟ تجھے احساس بھی ہے کہ پہاڑ سی زندگی گزرنا آسان ہے کیا؟'' ماں نے کہا۔

''آپ ہیں نا میرے پاس۔؟''

''دیوانی ہوئی ہے کیا؟ میں عمر کے آخری پڑاؤ پر پہنچ چکی ہوں کیا قیامت کے بوریئے سمیٹوں گی کوئی سنگ ساتھ رہے تو زندگی ہنسی خوشی گزر جاتی ہے''

''ماں محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے ماجد ایک بھلے انسان ہیں سارے دنوں میں مجھے ان کے مزاج کا بھی اندازہ ہو گیا ہے'' نرگس نے کہا

''چل جو تیری خوشی میں یہ تو نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے تو اپنی زندگی برباد کرے میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں''

نرگس نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں ''تم کتنی اچھی ہو ماں!''

□□□

Dr. Naghma Javed Malik
B-1,Gautam Apartment
seven Bungalows
Andheri west Mumbai 400053 (M.S)

لذیذ پکوان

سابودانہ برفی

سابودانہ برفی کے اجزا: سابودانہ - 1 کپ (185 گرام)، دودھ 3 کپ (750 ملی لیٹر)، چینی 150 گرام، گھی کپ 50 گرام، بادام کے فلیکس - ایک چمچ، کاجو ایک چمچ کٹا ہوا۔

سابودانہ تلنے کا عمل: 1 کپ (185 گرام) درمیانے سابودانہ کو گیلے کپڑے پر رکھیں اور اسے اچھی طرح صاف کریں۔ اب صاف کیا ہوا سابودانہ پین میں ڈالیں اور مسلسل ہلاتے ہوئے ہلکی آنچ پر 10 منٹ تک بھونیں۔ اگر وہ کافی کرسپی ہو جائیں تو نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد بھنے ہوئے سابودانہ کو مکسچر میں پیس لیں، پھر چھان کر پیالے میں نکال لیں۔

برفی کے لیے دودھ اور چینی مکس کرنے کا عمل: ایک پین میں 3 کپ فل کریم دودھ کو اس وقت تک پکائیں جب تک کہ یہ بہت تیز آنچ پر ابل نہ جائیں۔ ہلاتے ہوئے ابالیں جب تک کہ یہ تھوڑا گاڑھا نہ ہو جائے۔ دودھ کو تقریباً 20 منٹ تک پکائیں اور مسلسل ہلاتے رہیں تا کہ دودھ نیچے سے چپک نہ جائے۔

جب دودھ اچھی طرح پک جائے تو اس میں 150 گرام کپ چینی

ڈالیں اور اس وقت تک ہلاتے رہیں جب تک یہ گل نہ جائے۔ دودھ میں چینی مکمل طور پر گھل جانے کے بعد آگ بند کردیں اور پین کو سائیڈ پر رکھ دیں۔

برفی کے لیے پیڑے بنانے کا عمل: ایک پین میں 50 گرام کپ گھی ڈال کر گرم کریں۔ جب یہ گرم ہو جائے تو اس میں سابودانہ پاؤڈر ڈالیں اور گھی میں اچھی طرح مکس کرتے ہوئے ہلکی آنچ پر بھون لیں۔ سابودانہ سے ہلکی خوشبو آنے کے بعد اس میں 1 کھانے کا چمچ بادام اور 1 کھانے کا چمچ کٹے ہوئے کاجو ڈال کر بھون لیں۔ جیسے ہی اس کا رنگ تھوڑا سا بدلنے لگے تو آگ کو دھیمی کر کے اس میں ابلا ہوا دودھ ڈال دیں۔ اب مکسچر کو اس وقت تک ہلاتے رہیں جب تک کہ گھی نہ نکل جائے، پھر اس میں 5-6 پسی ہوئی الائچی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ برفی بنانے کے لیے پیڑے تیار ہو جائیں گے۔

برفی بنانے کا عمل: پلیٹ کو گھی سے گریس کریں اور اس مکسچر کو پلیٹ میں سیٹ کرنے کے لیے نکال لیں۔ چمچ کی مدد سے مکسچر کو یکساں بنائیں اور اوپر کٹے ہوئے پستے ڈال کر دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ وقت ختم ہونے کے بعد، مرکب اچھی طرح سے مضبوط ہو جائے گا۔ پھر چھری کی مدد سے اپنی پسند کی شکل میں کاٹ لیں، اس طرح میٹھا اور لذیذ سابودانہ برفی تیار ہو جائے گی۔ اس کے ذائقے سے لطف اندوز ہوں۔

مرمورا پوہا

مرمورا پوہا کے اجزا: پفڈ چاول-2 کپ (90 گرام)، ٹماٹر-1 (باریک کٹا ہوا)، آلو 1 (باریک کٹا ہوا)، تیل 2 چمچ، کچی مونگ پھلی ایک چوتھائی کپ، کالی سرسوں آدھا چائے کا چمچ، زیرہ زیرہ ایک چوتھائی عدد، کری پتے 15-20، ہلدی ایک چوتھائی چائے کا چمچ، ہری مرچ ایک کٹی ہوئی، چینی 1 چمچ، نمک ذائقے کے مطابق، لیموں ایک ٹیبل اسپون چمچ تھوڑا سا ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)

مرمورا کو دھونے کا عمل: ایک پیالے میں 2 کپ پفڈ چاول ڈالیں اور پانی سے دھو لیں۔ یاد رکھیں، پھٹے ہوئے چاولوں کو بھگونا نہیں ہے، اسے صرف پانی میں دھو کر باہر نکال لیں۔ ابلے ہوئے چاولوں کو پانی سے نکال کر چھلنی میں رکھ دیں (اس سے بچا ہوا سارا پانی نکل جائے گا)

مرمورا پوہا بنانے کا عمل: ایک ٹماٹر اور آلو لیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ اب ایک کڑھائی میں 2 کھانے کے چمچ تیل گرم کریں۔ اس میں کٹے ہوئے آلو ڈال کر تیز آنچ پر بھونیں۔ جب آلو ہلکے گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال لیں۔ پھر پین میں ایک چوتھائی کپ کچی مونگ پھلی ڈالیں اور ہلکی آنچ پر بھونیں جب تک کہ اس کا رنگ نہ بدل جائے مسلسل ہلاتے رہیں۔ بھوننے کے بعد ان کو بھی نکال لیں۔

اب اسی تیل میں آدھا چائے کا چمچ کالی سرسوں کے دانے ڈال کر ہلکے سے کڑکنے دیں۔ جب یہ پھٹ جائے تو اس میں ایک چوتھائی چمچ دو زیرہ اور کڑی پتے ڈال کر ہلکے سے مکس کریں۔ پھر اس میں 1 باریک کٹی ہری مرچ، چوتھائی چائے کا چمچ ہلدی، 1 چمچ چینی اور ذائقے کے مطابق نمک ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔

مصالحہ فرائی ہونے کے بعد اس میں 1 باریک کٹا ہوا ٹماٹر ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ پھر اس میں بھیگے ہوئے چاول ڈال کر مصالے میں ملا دیں۔ اب اس آمیزے میں بھنے ہوئے آلو اور مونگ پھلی ڈال کر مکس کریں (اگر آپ کو آلو پسند نہیں ہیں تو آپ اسے نکال بھی سکتے ہیں)۔ انھیں اچھی طرح مکس کرنے کے بعد اس میں 2 چائے کا چمچ ہرا دھنیا ڈال کر مکس کریں، پھر ڈھک کر ہلکی آنچ پر دو منٹ تک پکائیں۔

وقت ختم ہونے پر مزیدار پفڈ چاول تیار ہو جائیں گے۔ آگ بند کر کے اس میں لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ ہری مرچ اور لیموں کے ساتھ تھوڑا سا ہرا دھنیا ڈال کر گرم گرم سرو کریں اور پوہے کے ذائقے سے لطف اٹھائیں۔

(بحوالہ: www.nishamadhulika.com)

ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی

سن بلوغت
(Puberty)

سن بلوغت سے مراد لڑکیوں کا بچپن (Childhood) کے بعد جوانی کی سرحدوں میں داخل ہونا ہے ۔ اس دوران لڑکیوں میں کچھ تبدیلیاں (Changes) ہوتے ہیں جن سے لڑکی کے بالغ ہونے کا پتہ چلتا ہے ۔ اس دوران لڑکیوں میں میں حیاتیاتی (Biological) ، Morphological اور نفسیاتی (Psychological) تبدیلیاں ہوتی ہیں جس کے بعد لڑکیوں میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت آجاتی ہے۔ ان تبدیلیوں میں سب سے زیادہ نمایاں تبدیلی لڑکیوں میں حیض (Menstruation) کا جاری ہونا ہے۔

سن بلوغت کی ابتداء میں حیض کے علاوہ دوسری صنفی اور نسوانی تبدیلیاں بھی واقع ہوتی ہیں ،صرف حیض کے جاری ہونے کو بلوغت کی قطعی علامت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ حیض کے علاوہ دیگر تبدیلیاں مثلاً بغل اور زیر ناف کے بالوں (Pubic and Axillary hairs) کی روئیدگی، کولہوں کا بڑھ کر مدور ہوجانا، حوض (Pelvis) کی کشادگی ، فرج (Vagina) کا نمایاں درجہ تک بڑھ جانا ، پستانوں (Breasts) کا بڑھ جانا سر پستان (Nipple) کے گرد سرخ ہالہ بن جانا، قد کا تیزی سے بڑھنا، چہرے پر کیل مہاسے نکلنا شروع ہونا، جسم کے حصوں پر چربی کی مقدار بڑھنا وغیرہ جیسی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں جو لڑکی کو دوسری صنف سے الگ کرتی ہیں مثلاً لڑکی کے چہرے اور جسم پر بال نہیں اگتے اور لڑکوں کے مقابلہ میں آواز باریک ہوتی ہے۔ اگر حیض کے جاری ہونے کے ساتھ ساتھ یہ تمام تبدیلیاں بھی موجود ہوں تو سن بلوغت کا یقینی طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بلوغت کے دوران بہت سی اہم نفسیاتی تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں مثلاً قدرتی طور پر جنس مخالف کے لیے محبت کے جذبات ابھرتے ہیں، اور کشش پیدا ہوتی ہے ،خود کو بنا سنوار کر رکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ، خود اعتمادی بڑھ جاتی ہے ، جنسیات کے بارے میں معلومات جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

آغاز طمث (Menarche)

لڑکی کو زندگی میں پہلی بار حیض کا جاری ہونا ادرار طمث یا Menarche کہلاتا ہے۔ لڑکیوں میں حیض کا آغاز 10 سے 16 سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ جبکہ اس کا Peak Time 13 سال ہوتا ہے ۔ Ovary کے Oestrogen ہارمون کی وجہ سے رحم کی اندرونی پرت (Endometrium) میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جب Oestrogen کا level کم ہوجا تا ہے تو Endometrium کی Shedding ہوتی ہے اور مہبل سے جریان دم (Bleeding) شروع ہوجاتی ہے ۔ پہلے Period میں عام طور پر بیضہ (Ovum) نہیں ہوتا ہے ۔ شروعاتی دور میں بیضہ کے بننے (Ovulation) میں بے قاعدگی پائی جاتی ہے اور دو سال کے اندر اس

میں باقاعدگی(Regularity) آجاتی ہے۔

جنسیاتی اعضاء میں تبدیلیاں

Changes in Genital organs

مبیض(Ovary)

یہ لمبائی میں بڑھتی ہے اور گول ہوجاتی ہے۔ Ovary میں پائی جانے والی Stromal cells کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے۔رحم (Uterine body) اور عنق الرحم (Cervix) کا تناسب (Ratio) پیدائش کے وقت 1:2 ہوتا ہے جبکہ آغاز حیض (Menarche) کے وقت یہ 1:1 ہوجاتا ہے۔مہبل (Vagina) میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی ہیں، مہبل میں پائی جانے والے خلیات (Cells) کی تعداد اور پرت (layers) میں اضافہ ہوجاتا ہے Doderlein's bacilli نام کے بیکٹیریا مہبل میں رونما ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے Vagina کی pH کم ہوجاتی ہے، عام طور پر 4 اور 5 کے بیچ ہوجاتی ہے۔جس کی وجہ سے مہبل میں تعدیہ (Infection) کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔فرج (Vulva) کے سائز میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔اس کے علاوہ پستان (Breasts) میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوتی ہیں، ان میں ابھار ہوجاتا ہے اور یہ گول (Round) ہوجاتے ہیں۔

غیر طبعی سن بلوغت (Abnormal Puberty)

بعض اوقات بلوغت میں غیر طبعی تبدیلیاں ہوجاتی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں

1۔وقت سے پہلے بالغ ہونا (Precocious Puberty)

2۔ دیر سے بالغ ہونا (Delayed Puberty)

1.Precocious Puberty

اس صورت میں لڑکیوں میں حیض کا آغاز دس برس سے پہلے ہی ہوجاتا ہے اس کے علاوہ دسری صنفی اور نسوانی تبدیلیاں 8 برس سے پہلے ہی رونما ہوجاتی ہیں۔یہ صورت کبھی Oestrogen hormone کی کثرت کی وجہ سے ہوتی ہے جس کو طبی اصطلاح میں Isosexual کہتے ہیں۔اس کے برعکس جب Andogen hormone کے کثرت کی وجہ سے Precocious puberty ہوتی ہے تو اس کو Heterosexual کہتے ہیں۔یہ صورت لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں میں زیادہ عام ہوتی ہے۔اس کی مندرجہ ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

☆Premature thelarche

اس صورت میں 8 برس سے پہلے ہی صرف پستان (Breast) کا حجم طبعی سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔یہ قسم عام طور پر 2 اور 4 سال کے بیچ میں پائی جاتی ہے ۔ اس کے اسباب میں نصیۃ الرحم (Ovary)، Adrenal Gland اور دماغ کے ٹیومر عام ہے۔

☆Premature pubarche

اس صورت میں 8 سال سے پہلے ہی صرف بغل کے بال (Axillary hairs)، زیرناف کے بال (Pubic hairs) رونما ہونے لگتے ہیں۔

☆Premature Menarche

اس قسم میں صرف حیض کا آغاز وقت سے پہلے ہوجاتا ہے اور سن بلوغت کی دوسری علامات نہیں پائی جاتی ہیں۔اس کا سبب ابھی تک واضح نہیں ہے۔

2۔Delayed Puberty

اس صورت میں لڑکیوں میں 13۔14 سال تک پستان کا ابھار، بغل کے بال، زیرناف کے بال رونما نہیں ہوتے ہیں اور حیض کا آغاز 16 برس تک ہوتا ہے۔یہ صورت لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں میں زیادہ عام ہے۔اس کے اسباب میں Gonadal dysgeneis, Pure Gonadal dysgenesis, Ovarian failure, Chronic Illness, Primary Hypothyroidism وغیرہ شامل ہیں۔

خلاصہ کلام

سن بلوغت کا زمانہ لڑکیوں کا ایک اہم زمانہ ہوتا ہے اس دور میں لڑکیوں میں مختلف قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں اس لیے سن بلوغت میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں لڑکیوں کا جاننا بے حد ضروری ہے تاکہ لڑکیوں میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

حوالہ جات (References)

1۔ ڈی سی دتا، ٹکسٹ بک آف گائنوکولوجی، 7واں ایڈیشن، جے پی بردرس، نئی دہلی 2016، صفحہ 45-39

2۔ڈاکٹر (مسز) محمودہ انظر، رہنمائے امراض نسواں، ادارہ کتاب الشفا، نئی دہلی 2009، صفحہ 40-36

3۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن عسکری، امراض نسواں و علم القبالت، ادارہ کتاب الشفا، نئی دہلی 2004، صفحہ 43-40

4 ۔مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی، وصی میڈیکل ڈکشنری انگلش۔ اردو، مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ 2001، صفحہ 810, 967, 1127, 1165,1283

Dr. Mohd Safwan Kidwai

Village Turkani, Post Safdarganj

District Barabanki-225412(U.P)

Mobile:9005109892

حسن کی نگہداشت

سردیوں کے لیے جلد کی دیکھ بھال کے نکات

ان 14 طریقوں سے سردیوں میں خشک جلد کا خیال رکھیں

جلد کی دیکھ بھال ہر موسم میں اور ہمیشہ کی جانی چاہیے لیکن سردیوں میں جلد سے متعلق مسائل زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سردیوں میں جلد کو اضافی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر سردیوں میں جلد کی دیکھ بھال کیسے کی جائے؟

کچھ گھریلو ٹوٹکوں کے ذریعے آپ سردیوں میں اپنی جلد کو صحت مند اور خوبصورت رکھ سکتے ہیں۔ لیکن جلد کی دیکھ بھال کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جلد کیسی ہے۔ جلد کی 4 قسمیں ہوتی ہیں - روغنی، خشک، مخلوط اور نارمل۔ جلد کی مختلف اقسام کے لیے مختلف نسخوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

سردیوں میں جلد کی دیکھ بھال کیسے کریں؟

سردیوں میں جلد بہت خشک اور بے جان ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے وٹامن ای پر مشتمل موئسچرائزر لگانا ضروری ہے۔ چہرے کو صاف پانی سے دھوئیں اور ایک اچھا موئسچرائزر روزانہ رات کو اور دن میں 3-4 بار لگائیں۔

سردیاں آتے ہی لوگ گرم پانی سے نہانا شروع کردیتے ہیں لیکن خیال رہے کہ پانی زیادہ گرم نہیں ہونا چاہیے ورنہ یہ جلد کو خشک کردیتا ہے۔

سردیوں میں صابن کا استعمال کم سے کم کریں۔ اگر جلد خشک ہے تو اسکرب کرنا بھی بند کردیں کیونکہ اس سے جلد کے مسام کھل جائیں گے لیکن جلد بھی خشک ہوجائے گی۔ اگر جلد تیل والی ہو تب ہی اسکرب کریں تا کہ اس سے جلد کا تیل کم ہوسکے۔

سردیوں میں جلد کو ملائم اور چمکدار بنانے کے لیے دہی اور چینی کو اچھی طرح ملا کر چہرے پر لگائیں اور کچھ دیر خشک ہونے دیں، اس کے بعد ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں اور پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔

گرمیوں میں لوگ اکثر سن اسکرین کا استعمال کرتے ہیں لیکن سردیوں میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتے جب کہ سورج کی شعاعیں سردیوں

میں جلد کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔ اکثر لوگ دھوپ میں غسل کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے جلد کی ٹیننگ ہوتی ہے، یہ بے جان بھی ہو جاتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے سردیوں میں سن اسکرین کا استعمال ضروری ہے۔

سردی ہو یا گرمی، پانی وافر مقدار میں پییں تا کہ جسم میں پانی کی کمی نہ ہو۔ پانی کی وافر مقدار ہو تو جلد مردہ نہیں ہوگی اور چمک ہمیشہ رہے گی۔

اگر آپ جلد کو نرم اور صحت مند رکھنا چاہتے ہیں تو ناریل کے تیل کا استعمال کریں۔ ناریل کا تیل نہ صرف بالوں کے لیے مفید ہے بلکہ روزانہ نہانے سے ایک گھنٹہ پہلے جسم اور چہرے کی مالش کریں اور پھر نہائیں۔ جلد کبھی خشک نہیں ہوگی۔

گلیسرین، لیموں اور 3-4 قطرے عرق ملا کر مکسچر بنائیں اور شیشی میں رکھیں۔ اس مکسچر کو روزانہ رات کو سونے سے پہلے چہرے اور جسم پر لگائیں اور صبح اٹھ کر نیم گرم پانی سے غسل کریں۔

اگر ہاتھوں کی جلد بہت خشک ہے تو اس کے لیے یا تو لیموں اور چینی ملا کر ہاتھوں پر لگائیں، ورنہ شہد اور لیموں کو ملا کر ہاتھوں پر لگائیں اور کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد نیم گرم پانی سے دھو لیں، فائدہ ہوگا۔

انڈے اور شہد کا فیس ماسک جلد کو نرم اور صحت مند بنانے میں بھی بہت مدد کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک انڈے میں تھوڑا سا شہد ملا کر چہرے، ہاتھوں اور گردن پر لگائیں اور ایک یا دو گھنٹے بعد نیم گرم پانی سے دھو لیں۔

موسم کوئی بھی ہو، اگر آپ اپنی جلد کا خیال رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے متوازن غذا کھانا سب سے ضروری ہے۔ روزانہ کافی پانی پیئے۔ موسمی پھل اور سبزیاں کھائیں۔ سردیوں کا موسم ہے تو کھانے میں گاجر، پالک، میتھی، سرسوں، لیموں جیسی چیزیں شامل کریں۔ جوس پیو۔

بہت سے لوگوں کی جلد پہلے ہی خشک ہوتی ہے اور سردیوں میں ایسی جلد خراب ہو جاتی ہے۔ خشک جلد کے لیے دودھ بہترین ٹانک ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے فیس پیک میں ملا کر لگا سکتے ہیں یا اسی طرح کا دودھ چہرے پر لگا کر ہلکے ہاتھ سے مساج کر سکتے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ اگر آپ روزانہ یہ عمل کریں گے تو آپ کو جلد ہی فائدہ دیکھنے کو ملے گا۔

ایک بنیادی چیز جس کا خیال رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ سردیوں میں اپنی جلد کو گرم چیزوں جیسے دستانے، سویٹر اور اسکارف سے ڈھانپ کر رکھیں۔ پیٹرولیم جیلی، باڈی بٹر لگائیں تا کہ جلد کی نمی برقرار رہے اور وہ ٹوٹ نہ جائے۔

2 چمچ شہد میں ایک چمچ مکھن اور تھوڑا سا لیموں اور شہد ملا کر پیک بنائیں اور اسے چہرے کے علاوہ ہاتھوں اور گردن پر لگائیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے لیے لگا رہنے دیں اور پھر نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ یہ عمل سردیوں میں روزانہ کریں۔ اس سے نہ صرف جلد نرم اور صحت مند ہوگی بلکہ رنگت بھی نکھرے گی۔

(بحوالہ:www.bhaskar.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' نومبر 2021ء نظر نواز ہوا۔ اس کا سرورق دیدہ زیب و نہایت معنی خیز منظر پیش کرتا ہے۔ یہ ایک حسین و دلنشین مرقع ہے ماحول کے تحفظ کی ذمہ داری کا اور عکس ہے اداریہ کی فکر انگیز آموزش کا۔ (ص4)

ماحولیاتی تانیثیت اور متعلقہ تحریکیں تمام تر ماحول یعنی جاندار و بے جان مخلوق کے تحفظ کی ذمہ داری انسانوں پر عائد کرتی ہیں۔ ماحول اور تانیثیت میں یہ بنیادی یکسانیت ظاہر کی گئی ہے کہ ماحول کی ہر شئے اپنے پھل پھول کی اسی طرح پرورش و پرداخت کرتی ہے جس طرح ایک ماں اپنی نسل کو پروان چڑھاتی ہے۔ اس میں تذکیر کو محاذی بلکہ معاندانہ کردار ظاہر کیا گیا ہے جو منطق اور حقیقت سے بعید ہے کیوں کہ کوئی پھل پھول بنا ذکری اعانت کے ظاہر نہیں ہوسکتا۔ اس تھیوری میں مفاہمت کے بجائے تقابل کو ہوا دی گئی ہے جبکہ اس تصور کو منطقی اساس پر پیش کیا جانا چاہیے تھا۔

اداریہ کے علاوہ اس شمارہ میں کوئی دس اصناف سخن کے ذیل میں 15 سے زائد عنوانات شامل ہیں جن کا مختصر مذکور یوں ہے کہ ''شخصیت'' (ص5 تا9) میں ''صدیقہ بیگم سیوہاری کی افسانہ نگاری'' پر روایتی مگر اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ پردہ کی پاس داری کر کے بھی کوئی خاتون بہترین ادب پیش کرسکتی ہے۔ ''جہانِ نسواں'' (ص10 تا ص37) میں سات مقالہ جات تحریر ہیں۔ پہلا مضمون مولانا ابوالکلام آزاد اور ہند کے اتحاد پر لکھا گیا ہے۔ اچھا مضمون ہے۔ باقی مضامین بھی گوارہ ہیں۔ کچھ مضامین میں تضاد بھی پایا گیا ہے۔ مثلاً محترمہ تبسم فاطمہ نے اپنے شوہر کے ساتھ معاونت ضرور کی اور شوہر بھی ان کے معترف رہے (ص17) مطلب یہ کہ دونوں میں تال میل تھا۔ مگر آگے لکھا ہے کہ افسانہ ''صحرا میں نہیں رہنا'' کی عورت وہی سب سوچتی ہے جو تبسم فاطمہ سوچتی ہیں۔ پھر لکھا ہے ''یہ کیسی آزادی ہے کہ ساری زندگی ایک چہار دیواری کے اندر ایک ایسے آدمی کے ساتھ بسر کی جائے جس سے نہ خیال ملتے ہوں نہ معیار اور وہ ہر وقت ساتھ میں پنجرہ لیے گھومتا رہتا ہو.... زیادہ اُڑو مت پنجرہ میں آجاؤ....'' (ص18) اس تمام بیان میں تضاد محسوس ہوتا ہے۔ مضمون میں محض مسائل ہی نہیں بلکہ ان کا حل بھی تجویز کرنا چاہیے۔ مقالہ ''عبدالماجد دریابادی کی صحافت نگاری'' بہت خوب اور نہایت معلوماتی مضمون ہے۔ ''حسن سخن'' (ص52 سے 53) میں ڈاکٹر نفیس بانو صاحبہ کی غزل کی زمین زرخیز ہے جبکہ عنبرین فاطمہ صاحبہ کی غزل بہت عمدہ ہے۔ خصوصاً یہ شعر ؎

صبر سے جبر تک کی مسلسل گھڑی
جو گزرتی نہیں وہ گزاری گئی

ص53 پر دی گئی آزاد نظم بھی گوارہ ہے۔ ''باورچی خانہ'' (ص54 اور 55) میں پانچ ملذذ پکوانوں کی ترتیب دی گئی ہے۔ آزمائش باقی ہے۔ ''صحت'' (ص56 تا58) میں دوران حمل قئے اور علاج و پرہیز کی تجاویز دی گئی ہیں۔ جبکہ ''آرائش و زیبائش'' (ص59 اور 60) کے تحت خوبصورتی کی نگہداشت کے لیے چہرے کے دھبوں، جسمانی امراض اور مسوڑھوں کے انفیکشن کو ٹالنے کے جتن بتائے گئے ہیں اور آخر میں ص61 پر تاثرات اور ص62 پر خواتین خبرنامہ دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ شمارہ نہایت شگفتہ ہوگیا۔

مصطفی ندیم خان غوری، زرّین ولا، بی-١١، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

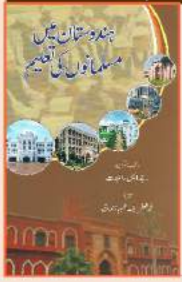

ترتیب و تدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد عطر یف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

مغربی تعلیم اور مسلمان

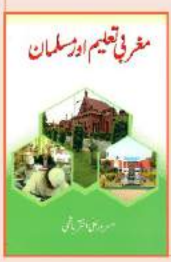

مصنف و مترجم: مسرور علی اختر ہاشمی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 240

قیمت: 130 روپے

دیوان داراشکوہ

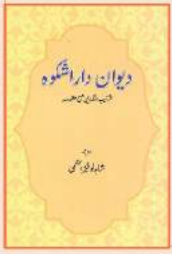

مترجم: شاہد نوخیز اعظمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 208

قیمت: 125 روپے

علم البیان: اقسام نثر و نظم

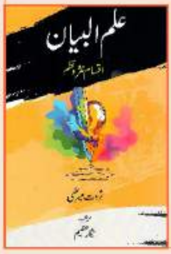

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

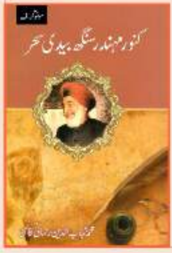

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

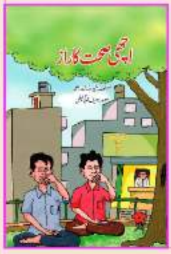

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जनवरी –२०२२ वर्ष:६ , अंक: १

Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2022, Vol.6 , Issue: 1

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-01-2022
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 ، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6